فروری ۱۹۹۶ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

عہدِ حاضر میں نظامِ خلافت

کا دستوری، قانونی اور سیاسی ڈھانچہ — اور اس کے نفاذ کا طریق کار

عالمی احیاءِ خلافت کانفرنس میں داعیٔ تحریکِ خلافت کا خطاب

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

فضیلتِ صیام و قیامِ رمضان

بزبانِ صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسولُ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ

وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ

وَمَنْ قَامَ لَیْلَۃَ الْقَدْرِ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ

(رواہ البخاری و مسلم)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے رمضان کے روزے رکھے ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے گئے۔ اور جس نے رمضان (کی راتوں) میں قیام کیا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کے بھی تمام سابقہ گناہ معاف کر دیئے گئے۔ اور جو لیلۃ القدر میں کھڑا رہا (قرآن سننے اور سنانے کے لیے) ایمان اور خود احتسابی کی کیفیت کے ساتھ اس کی بھی سابقہ تمام خطائیں بخش دی گئیں!"

(صحیح بخاری و صحیح مسلم)

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد: ۴۵

شمارہ: ۱

رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ

فروری ۱۹۹۶ء

فی شمارہ ۱۰/-

سالانہ زرتعاون ۱۰۰/-

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زر تعاون برائے بیرونی ممالک

○ ایران، ترکی، اومان، مسقط، عراق، الجزائر، مصر 10 امریکی ڈالر

○ سعودی عرب، کویت، بحرین، عرب امارات
قطر، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان 17 امریکی ڈالر

○ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ 22 امریکی ڈالر

توسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارۂ تحریر

شیخ جمیل الرحمٰن

حافظ عاکف سعید

حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700۔فون: 03-02-5869501

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ، لاہور، فون: 6305110

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چوہدری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

☆ عرض احوال ——— ۳
خالد محمود خضر

☆ تذکرہ و تبصرہ ——— ۵
عہد حاضر میں نظام خلافت کا دستوری' قانونی اور سیاسی ڈھانچہ
اور اس کے نفاذ کا طریق کار
ڈاکٹر اسرار احمد

☆ بحث و نظر ——— ۲۷
نکاح' طلاق اور حلالہ ۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں
پروفیسر عبداللہ شاہین

☆ حسن انتخاب ——— ۴۱
قتل مرتد۔ عقلی جواز (۲)
مخالفین کے اعتراضات کے جواب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی نگارشات

☆ افہام و تفہیم ——— ۵۱
سرحد سے ایک خط اور امیر تنظیم کا جواب

☆ کتابیات ——— ۶۵
نفاق کی نشانیاں (۲)
مترجم : ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

☆ افکار و آراء ——— ۷۵
رمضان المبارک اور ہم — میم' سین

☆ گوشہ خواتین ——— ۷۸
مجھے اکثر خیال آتا ہے — طیبہ یاسمین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض احوال

نیکیوں کا موسم بہار رمضان المبارک اپنے دامن میں اللہ کی رحمتیں، برکتیں اور مغفرتیں لئے ہوئے ہم پر سایہ فگن ہے۔ رمضان المبارک نزولِ قرآن کا مہینہ ہے (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ) اور اس نسبت سے یہ قرآن حکیم سے تجدیدِ تعلق کا مہینہ ہے۔ چنانچہ اس ماہ مبارک کے لئے ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوگونہ پروگرام عطا کیا گیا ہے، یعنی دن کا روزہ اور رات کا قیام اور اس میں قراءت و استماعِ قرآن۔ روزے کے ساتھ قرآن حکیم کے خصوصی تعلق کی اہمیت بعض احادیث نبویؐ میں بھی اجاگر کی گئی ہے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "روزہ اور قرآن دونوں بندے کی سفارش کریں گے۔ (یعنی اس بندۂ مومن کی جو دن میں روزے رکھے گا اور رات میں اللہ کے حضور کھڑے ہو کر اس کا پاک کلام قرآن مجید پڑھے گا یا سنے گا) روزہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! میں نے اس بندے کو کھانے پینے اور نفس کی خواہش کو پورا کرنے سے روکے رکھا تھا، سو آج میری سفارش اس کے حق میں قبول فرما۔ اور قرآن کہے گا: میں نے اسے رات کو سونے اور آرام کرنے سے روکے رکھا تھا، پس تو آج اس کے حق میں میری سفارش قبول فرما! چنانچہ روزہ اور قرآن دونوں کی سفارش اس بندے کے حق میں قبول کی جائے گی (اور اس کے لئے جنت اور مغفرت کا فیصلہ فرما دیا جائے گا۔)

روزے کی عبادت کو ماہ رمضان کے ساتھ مخصوص کرنے کی حکمت بھی یہی ہے کہ رمضان نزولِ قرآن کا مہینہ ہے اور روزے اور قرآن کے مابین ایک خصوصی تعلق ہے۔ انسانی وجود روحِ ربانی اور جسدِ حیوانی کا مجموعہ ہے اور ان دونوں کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں، متضاد بھی ہیں۔ رمضان المبارک کا پروگرام درحقیقت روح انسانی کو غذا فراہم کرنے اور اسے تقویت پہنچانے کا پروگرام ہے، اور اس کے ذریعے جسد انسانی کے تقاضوں کو محدود کر کے روح انسانی کے تقاضوں کو پوری طرح آسودگی اور سیرابی کا موقع فراہم کیا جانا مقصود ہے۔ چنانچہ اس دوگونہ پروگرام میں ایک طرف دن کا روزہ جسد انسانی کے ضعف و اضمحلال کا سبب بنتا ہے اور اس طرح روح انسانی پر سے مادی وجود کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑتی ہے تو دوسری طرف رات کا

قرآن کے ساتھ قیام اس روح کی بھوک کی سیری اور پیاس کی آسودگی کا کام کرتا ہے۔ روحِ انسانی اور کلامِ ربانی کا اپنی اصل کے اعتبار سے چونکہ آپس میں گہرا قرب و تعلق ہے لہٰذا روحِ انسانی پر کلامِ ربانی کا یہ "نزول" اس کے لئے بیش بہا خیر و برکت کا موجب بنتا ہے اور فیوض و برکات کی یہ بارش کشتِ قلوب کی آبیاری کا بہترین ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

ماہ رمضان المبارک کی راتوں کا اکثر و بیشتر حصہ قرآن حکیم کے ساتھ گزارنے اور قرآن کے انوار و اسرار سے بیش از بیش استفادے کی غرض سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ' نے آج سے بارہ برس قبل نماز تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمہ قرآن کا آغاز فرمایا تھا' جو بحمد اللہ انتہائی مفید ثابت ہوا۔ اس کے بعد سے امیر محترم اپنی گرتی ہوئی صحت کے باوجود' ہر رمضان میں دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ قرآن اکیڈمی لاہور میں متعدد بار اور اس کے علاوہ قرآن اکیڈمی کراچی' قرآن اکیڈمی ملتان اور ابوظہبی میں بھی امیر محترم دورۂ ترجمہ قرآن کے پروگرام کروا چکے ہیں۔ گزشتہ سال امریکہ میں مقیم رفقاء و احباب کے شدید اصرار اور اس کام کی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے امیر محترم نے نیو جرسی میں بزبانِ انگریزی دورۂ ترجمۂ قرآن کا آغاز کیا تھا' لیکن گھٹنوں کی تکلیف میں شدید اضافہ کے باعث سورۂ آل عمران کی تکمیل کے بعد یہ پروگرام موقوف کرنا پڑا۔ اس سال امیر محترم نے انگریزی میں دورۂ ترجمہ قرآن کا پروگرام حال ہی میں تعمیر ہونے والے مسلم سنٹر آف نیویارک میں شروع کیا ہے' جہاں یہ پروگرام بحمد اللہ کامیابی سے جاری ہے۔

قرآن اکیڈمی لاہور کو' جہاں سے اس کارِ خیر کا آغاز ہوا تھا' یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں ہر سال رمضان کی مبارک راتیں قرآن کی معیت میں بسر کرنے کا یہ پروگرام اہتمام کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ چیز اب یہاں ایک روایت کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس بار یہاں ڈاکٹر عبدالسمیع دورۂ ترجمہ قرآن کی سعادت حاصل کر رہے ہیں' جو اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے روزانہ فیصل آباد سے لاہور تشریف لاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک بھر میں دورۂ ترجمہ قرآن کے بیسیوں حلقے قائم ہیں جن میں ہزاروں طالبانِ قرآن رمضان المبارک کی راتوں میں قرآن حکیم کے ساتھ اپنے تعلق کی تجدید میں مصروف ہیں۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ!

عہدِ حاضر میں نظامِ خلافت

کا دستوری، قانونی اور سیاسی ڈھانچہ

اور اس کے نفاذ کا طریق کار

ڈاکٹر اسرار احمد

مینارِ پاکستان کے سائے میں منعقد ہونے والی عالمی احیاء خلافت کانفرنس کے دوسرے روز (۲۱ / اکتوبر ۱۹۹۵ء) اپنے فکر انگیز خطاب کے آغاز میں داعیٔ تحریک خلافت پاکستان اور امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ العالی نے خطبہ مسنونہ کے بعد موضوع سے متعلق آیاتِ قرآنی کی تلاوت کی اور ایک حدیث نبویؐ بیان کی۔ پھر آنجناب نے اپنے گزشتہ روز کے خطاب کے بعض نکات کی وضاحت کے بعد فرمایا:

عالمی احیاء خلافت کانفرنس کے دوسرے روز آج میری گفتگو اس موضوع پر ہو گی کہ نظام خلافت کا دستوری، قانونی اور سیاسی ڈھانچہ کیا ہو گا؟ اس کے ضمن میں میں تین باتیں عرض کیا کرتا ہوں کہ کسی بھی جمہوری نظام میں آپ یہ تین باتیں شامل کر دیں تو وہ خلافت کا نظام بن جائے گا۔ میں اسلام میں جمہوریت کا قائل ہوں بلکہ دنیا کو جمہوریت اسلام ہی نے دی ہے۔ البتہ "ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں" کے مصداق دنیا نے اس میں گندگی کی آمیزش کر ڈالی ہے۔ اسلام نے دنیا کو جمہوری خلافت (Popular Vicegerency) عطا کی تھی لیکن شیطان نے اسے جمہوری حاکمیت (Popular Sovereignty) بنا دیا۔ گویا۔

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر!

ورنہ جمہوریت تو حقیقت کے اعتبار سے عطیۂ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ بہرحال کسی بھی جمہوری نظام میں' چاہے وہ پارلیمانی ہو' چاہے صدارتی ہو' وحدانی (unitary) طرزِ حکومت ہو' وفاقی (Federal) ہو یا نیم وفاقی (Confederal)' اس میں اگر تین چیزیں شامل کر دیجئے تو وہ خلافت بن جائے گی۔

۱۔ اللہ کی حاکمیت

اس کے لئے قرآن حکیم میں متعدد آیات وارد ہوئی ہیں۔ مثلاً سورۂ یوسف میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف: ۴۰و۶۷) یعنی "حاکمیت کا اختیار کسی کو نہیں' سوائے اللہ کے"۔ گویا۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آزری

سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں الفاظ وارد ہوئے: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ﴾ (آیت ۱۱۱) یعنی "بادشاہت میں اس کا کوئی ساجھی نہیں"۔ جبکہ سورۃ الکہف میں فرمایا: ﴿وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا﴾ (آیت ۲۶) یعنی "وہ اپنی حاکمیت میں کسی کو شریک نہیں کرتا"۔ نوٹ کیجئے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فعل ماضی آیا ہے جبکہ سورۂ کہف میں فعل مضارع ہے۔ اور اس طرح ان دونوں مقامات پر یہ مضمون مکمل ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے قرآن حکیم میں بعض مقامات پر "سَبَّحَ لِلّٰهِ" اور بعض جگہ "يُسَبِّحُ لِلّٰهِ" کے الفاظ آتے ہیں۔ پھر سورۃ الحدید میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ "اسی کے لئے بادشاہت ہے آسمانوں اور زمین کی" چنانچہ حاکمیت (Sovereignty) صرف اللہ کی ہے اور انسان کے لئے خلافت (Vicegerency) ہے۔

اس اعتبار سے ہم انتہائی خوش قسمت ہیں کہ صحیح وقت پر' صحیح تدبیر اور صحیح اقدام کے نتیجے میں اس ملک میں قراردادِ مقاصد پاس ہوئی' جس سے کم از کم یہ پہلی شرط سلطنتِ خداداد پاکستان میں بہت جلد پوری ہو گئی۔

۲۔ قرآن وسُنّت کی بالادستی

ہمارے دستور میں قانون سازی کی حدود کا تعین بھی بایں الفاظ کر دیا گیا تھا :

"No legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah"

یعنی قانون سازی کسی سطح پر بھی ہو' خواہ میونسپلٹی کی سطح پر ہو' ریاست کی سطح پر یا وفاق کی سطح پر' اس ملک میں قانون سازی کتاب و سنت کی نصوص کے خلاف نہیں کی جائے گی۔ یہ وہ دفعہ ہے جو ہمارے دستور میں ہمیشہ سے شامل رہی' لیکن اس انداز سے جیسے کسی شراب خانے کے افتتاح کے لئے قرآن مجید کی تلاوت کر لی جائے۔ دستور میں اس کی حیثیت ہمیشہ Directive Principle کی رہی اور اسے Operative Clause نہیں بنایا جا سکا۔ اسے ایک بڑا بھاری پتھر سمجھ کر چوم چوم کر چھوڑا گیا ہے' کبھی دس سال کے لئے' کبھی بیس سال کے لئے' کبھی یہ وعدہ کر کے کہ نفاذِ شریعت ایکٹ کے بعد دستوری ترمیم بھی بس آیا چاہتی ہے' لیکن پھر وہ کبھی نہیں آئی۔ خدا خدا کر کے ضیاء الحق صاحب کے زمانے میں اسے دستور کی Operative Clause بنایا گیا' لیکن اس طور سے کہ اسے دو ہتھکڑیاں اور دو بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ یعنی دستور پاکستان کو قرآن و سنت کی بالادستی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا' عدالتی قوانین و ضوابط کو بھی شریعت سے ماوراء سمجھا گیا' اور عائلی قوانین اور مالی قوانین کو بھی شریعت کی پابندیوں سے آزاد رکھا گیا۔ چنانچہ شرعی عدالتوں کا قیام اور اس طرح کے دوسرے اقدام ایک سعی لاحاصل (exercise in futility) قرار پائے اور ان سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا' سوائے اس کے کہ کچھ ججوں کو تنخواہیں اور کچھ مفتی حضرات کو بھتے ملتے رہے اور بہت سارے مسودہ ہائے قانون کہ جن کی اصل اہمیت کچھ بھی نہیں ہے' جمع ہوتے چلے گئے۔ نواز شریف کی آئی جے آئی کی حکومت دو تہائی اکثریت کے باوجود اس بھاری پتھر کو نہیں اٹھا سکی۔

سورۃ الحجرات کی پہلی آیت میں ہمیں یہی اصولی ہدایت ملتی ہے :

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾

"اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی مت کرو!"

یعنی دیکھو مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی حدود سے آگے مت بڑھنا' اس کے اندر رہو' جیسا کہ سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا: ﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ﴾ (البقرہ: ۲۲۹) "یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں' پس ان سے تجاوز مت کرو"۔ میرے نزدیک ﴿ لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾ کے الفاظ کی دستوری زبان میں بہترین ترجمانی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"No legislation can be done repugnant to the Quran and the Sunnah"

البتہ اس ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ اس کی تنفیذ کیسے ہوگی۔ دستور میں لکھ تو دیا گیا کہ قرآن و سنت کے خلاف قانون سازی نہیں کی جا سکے گی اور کتاب و سنت بالاترین قانون ہے' لیکن یہ ہوگا کیسے؟ اس ضمن میں راہنمائی ہمیں سورۃ النساء کی درج ذیل آیت سے ملتی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝ ﴾ (آیت ۵۹)

"اے اہلِ ایمان' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحبِ امر ہوں۔ پھر اگر تمہارے مابین کسی معاملے میں نزاع ہو جائے (اختلاف ہو جائے) تو اسے لوٹا دو اللہ اور رسول کی طرف اگر تم واقعتاً ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور یومِ آخرت پر۔ یہی ایک صحیح طریق کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے"۔

اس آیتِ مبارکہ میں' جو کہ اسلامی ریاست کے اہم ترین موضوع سے بحث کر رہی ہے' دو خلا موجود ہیں۔ (میری اس بات کو کہیں قرآن مجید کی توہین پر محمول نہ کر لیجئے گا!) پہلا خلا یہ ہے کہ وہ اولوالامر کیسے وجود میں آئیں گے' ان کا نصب کیسے ہوگا۔ اس کا پورے قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے' جبکہ دستور کا سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ اولوالامر کا

نصب کیسے ہو گا۔ ہمارے فقہاء نے کہا ہے کہ وہ متغلّب بھی ہو سکتا ہے یعنی جس نے از خود غلبہ حاصل کر لیا ہو' اور اگر وہ کتاب و سنت کے خلاف نہیں جا رہا ہے تو اس متغلّب کی اطاعت بھی لازم ہے' جیسے مارشل لاء آ جاتا ہے تو کیا کریں گے' سوائے اس کے کہ جسٹس کیانی مرحوم کی طرح ایک پھبتی چست کر دیں :

"Misfortunes never come alone, but this time they have come in battalions"

یعنی بد قسمتیاں کبھی اکیلے نہیں آیا کرتیں' لیکن اس بار تو وہ لشکروں کے ہمراہ آئی ہیں۔ کوئی عدالت کہہ دے گی اب آپ آ گئے ہیں تو آپ کو "نظریۂ ضرورت" کے تحت برداشت کرتے ہیں' اب آپ نوے دن کے بعد چلے جایئے اور وہ نوے دن نو سو بھی ہو سکتے ہیں' نو ہزار بھی ہو سکتے ہیں۔ قرآن نے اس پورے مضمون سے غضِّ بصر کیا ہے یا صرفِ نظر کیا ہے۔

دوسرا خلا یہ ہے کہ اولوالامر سے اختلاف کی صورت میں اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ معاملہ قرآن و سنت کے مطابق ہے یا نہیں۔ فرض کریں والیٔ امر ایک حکم دیتا ہے اور میں ریاست کا ایک شہری ہوتے ہوئے یہ سمجھتا ہوں کہ یہ حکم کتاب و سنت کی حدود سے متجاوز ہے۔ اب قرآن تو یہ کہتا ہے کہ اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف پھیر دو۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے فیصلہ کرو۔ لیکن اس کا فیصلہ کہاں اور کیسے ہو گا؟ اللہ آسمانوں پر ہے اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی بہرحال انتقال ہو چکا ہے' اب کہاں جائیں' کہاں فریاد کریں' کونسے دروازے کو کھٹکھٹائیں؟ کیا یہ خلا یہاں موجود نہیں ہے؟۔

اب اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں نے جن دو باتوں کے لئے "خلا" کا لفظ استعمال کیا ہے ان کی وضاحت حدیثِ نبوی (ﷺ) سے ہو جاتی ہے۔ میں اس کے لئے ایک حدیث پیش کر رہا ہوں جو مرتبے کے لحاظ سے حدیثِ حسن ہے۔ حضرت ابو ثعلبہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

((اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوھَا' وَحَدَّ حُدُوْدًا

فَلَا تَعْتَدُوهَا' وَحَرَّمَ اَشْيَاءَ فَلَا تَنْتَهِكُوهَا' وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَاءَ رَحْمَةً لَّكُمْ غَيْرَ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا))

(رواہ الدارقطنی)

"اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں فرض کردی ہیں ان کو ضائع مت کرنا (ان کی پابندی کرنا)' اور اس نے کچھ حدود مقرر کردی ہیں ان سے تجاوز مت کرنا' اور اس نے کچھ چیزوں کو حرام قرار دے دیا ہے' ان کے قریب نہ پھٹکنا' اور اس نے بہت سی چیزوں سے سکوت اختیار کیا ہے' تمہارے لئے رحمت کی بنیاد پر (تمہاری مصلحت کی خاطر) کسی بھول چوک یا لاعلمی کی وجہ سے نہیں' ایسی چیزوں کے بارے میں کھود کرید مت کرنا"۔

چنانچہ نوٹ کیجئے کہ قرآن حکیم میں جن چیزوں سے سکوت اختیار کیا گیا ہے وہ ہمارے لئے اللہ کی رحمت کے طور پر ہے' یا اس کی حکمت کا مظہر ہے' یا ہمیں تکلیف مالایطاق سے بچانا مقصود ہے۔ اس لئے کہ نوع انسانی کا عمرانی شعور ابھی وہاں تک نہیں پہنچا تھا کہ یہ مباحث چھیڑ دیئے جاتے' لہٰذا ان کے بارے میں خاموشی اختیار کی گئی کہ جب تک نوع انسانی کا عمرانی شعور اس سطح تک نہ پہنچ جائے اور اس کے لئے مناسب ادارے وجود میں نہ آ جائیں اس معاملے کے اندر سکوت بہتر ہے۔

<u>قانون سازی اور عدلیہ کا کردار</u> : اس ضمن میں عدلیہ کا ادارہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مجھے بڑی خوشی ہے کی یہ بات مولانا گوہر رحمان صاحب نے گزشتہ روز ہماری خلافت کانفرنس میں اپنے خطاب کے دوران کہی کہ عدلیہ کو اس کا حق دیا جانا چاہئے۔ میرے نزدیک ان کا سیاسی فکر بہت پختہ ہے اور جہاں تک اسلامی ریاست کا تصور ہے وہ بہت صحیح ہے۔ البتہ انہوں نے' میرے خیال کے مطابق' جہاں کچھ کمزوری دکھائی ہے اس کا تذکرہ بھی میں بعد میں کروں گا۔ میں نے ابھی سورۃ النساء کی آیت ۵۹ کے مضمون میں جس دوسرے خلا کا تذکرہ کیا ہے اس کے ضمن میں عدلیہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اگر ریاست کے کسی شہری کو کسی مسودۂ قانون پر اعتراض ہو اور وہ اسے کتاب و سنت کے منافی سمجھتا ہو تو یہ اس کا حق ہے کہ اعلیٰ عدالت میں اس کے موقف کو سنا جائے اور موقع دیا جائے کہ وہ علماء

اور دانشوروں کو عدالت میں لاکر اپنے موقف کو ثابت کرے۔

دورِ حاضر میں یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ریاست کے تین ستون ہیں' مقننہ (Legislature)' انتظامیہ (Executive) اور عدلیہ (Judiciary) اور دستور کی محافظ عدلیہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر دستور میں یہ طے ہے کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی تو اس کی بنیاد پر جاکر عدالت کا کنڈا کھٹکھٹانا ریاست کے ہر شہری کا حق ہے۔ یہ ریاستی ادارے رفتہ رفتہ پروان چڑھے ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مقننہ' انتظامیہ اور عدلیہ سب یکجا تھیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں علیحدہ عدالتی نظام بننا شروع ہوا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یہاں تک پہنچ گیا کہ مناسب شہادتیں موجود نہ ہونے کی بناء پر خلیفہ وقت کا دعویٰ بھی خارج ہو گیا۔ بہرحال ان ریاستی اداروں کے پروان چڑھنے اور مستحکم ہونے میں وقت لگا ہے۔ اور میرے نزدیک جس طرح سائنسی ترقی کے ثمرات ہمارا اثاثہ' ہماری وراثت اور ہمارا ورثہ ہیں' اسی طرح "اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ" کے مصداق ہمیں ان ریاستی اداروں کو بھی اپنانا چاہئے۔ کتاب وسنت کی بالادستی تسلیم شدہ ہو تو اول تو خود مقننہ قانون سازی کرتے ہوئے ہوشیار رہے گی' مجلس ملی یا پارلیمنٹ کے سر پر یہ تلوار لٹک رہی ہو گی کہ وہ کتاب وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنا سکتے۔ جب انہیں معلوم ہو کہ ہم محنت کر کے ایک قانون بنائیں' اس کی پہلی خواندگی ہو' دوسری خواندگی ہو' پھر تیسری خواندگی ہو' لیکن اس کے بعد کوئی شخص عدالت میں جاکر اسے کتاب وسنت کے منافی ثابت کر کے کالعدم قرار دلوا سکتا ہے تو وہ پہلے ہی سے اس کے لئے اپنے ماہرین کی خدمات حاصل کریں گے اور اپنی پوری پوری صلاحیت بروئے کار لائیں گے۔ لیکن اگر اس کے بعد بھی کسی کا اطمینان نہ ہو تو اس کا یہ حق ہے کہ وہ جاکر اعلیٰ عدالتوں کے در پر دستک دے۔

البتہ مجھے عرض کرنا ہے کہ مولانا گوہر رحمان صاحب کو بہت بڑی ٹھوکر لگی ہے جو انہوں نے کہا ہے کہ پاکستان کا دستور تو اسلامی ہے۔ میں ان سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا۔ ایک اور "بزرگ معصوم" شخصیت میاں طفیل محمد صاحب سے بھی میں نے یہ الفاظ سنے ہیں کہ "اسلامی دستور تو بن گیا' مسئلہ اس حکومت کا ہے"۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ اس

ضمن میں کتنی "معصومانہ" باتیں کہی جا رہی ہیں۔ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ قراردادِ مقاصد میں صرف "لاالٰہ الااللہ" ہے، "محمدؐ رسول اللہ" نہیں ہے، جبکہ دین "لاالٰہ الااللہ" سے مکمل نہیں ہوتا، "محمدؐ رسول اللہ" دین کا جزوِ لاینفک ہے۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اور سب کو معلوم ہے کہ قراردادِ مقاصد میں کہیں نبوت و رسالت کا تذکرہ نہیں ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قراردادِ مقاصد کی منظوری ایک بہت بڑا انقلابی معاملہ تھا کہ اس میں انسانی حاکمیت کو مسترد کر کے اللہ کی حاکمیت کی بات کی گئی۔ اور اس پر ہمارے حکمرانوں کے سر شرم سے جھک گئے تھے ع "کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں!" لیکن یہ بات بہرحال نامکمل بات ہے اور جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ یہاں کوئی قانون سازی کسی مرحلے پر، کسی سطح پر، کسی گوشے میں قرآن و سنت کے منافی نہیں کی جا سکتی اس وقت تک کلمہ طیبہ کا دوسرا جزو مکمل نہیں ہوتا۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے صحیح سمت میں ایک قدم اٹھایا ہے۔ اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیجئے۔ جن لوگوں نے اس کے لئے محنت کی ہے اللہ تعالیٰ انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔ لیکن اس کے بعد جو اصل ہڈی پھنسی ہے وہ نہ آئی جے آئی کے حلق سے نیچے اتری ہے اور نہ ہی ضیاء الحق صاحب کے حلق سے اتر سکی تھی۔ انہوں نے اسے دستور کا حصہ بنایا بھی تو اس انداز سے کہ دو بیڑیاں اور دو ہتھکڑیاں ڈال کر وفاقی شرعی عدالت میں لے آئے۔ میں ان کے اس اقدام کو محض "exercise in futility" اور "window dressing" سے تعبیر کرتا ہوں۔ میرے نزدیک جب تک یہ دفعہ مؤثر دستوری حیثیت اختیار نہیں کرتی کہ "یہاں کتاب و سنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا" اُس وقت تک کلمہ طیبہ کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔ اور محض "لا الٰہ الااللہ" کہنے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہوا کرتا جب تک کہ وہ "محمدؐ رسول اللہ" بھی نہ کہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہ کرلے۔

۳۔ غیر مسلموں کی حیثیت کا تعین

موجودہ مغربی جمہوریت جو کہ اس دور کا سب سے بڑا شرک اور سب سے بڑا کفر ہے' تین عناصر پر مشتمل ہے : i) حاکمیتِ جمہور (popular Sovereignty)' ii) سیکولرزم' iii) نیشنلزم ---- گویا اس میں تین بتوں کی پوجا کی جاتی ہے اور تیسرے بت (نیشنلزم) کا تقاضا یہ ہے کہ ایک جغرافیائی حد میں رہنے والے سب ایک قوم ہیں۔ یہ پاکستانی قوم ہے' وہ ہندوستانی قوم ہے' یہ امریکن نیشن ہے' یہ فرنچ نیشن ہے۔ یہ تصور بنیادی طور پر اسلامی ریاست کے منافی ہے اور تحریک پاکستان اس نظریئے کی نفی تھی کیونکہ پاکستان دو قومی نظریئے کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا' اس کی منزل اسلام تھا' نظامِ خلافت تھا۔ "الکفرُ مِلّۃٌ واحِدۃ" کے مصداق ساری غیر مسلم قومیں تو ایک ملت ہو سکتی ہیں' لیکن مسلمان اس ملت کا جزو نہیں بن سکتے۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں مکمل شہریت صرف مسلمان کو حاصل ہو گی اور کسی غیر مسلم کو' خواہ وہ ہندو ہو' پارسی ہو' عیسائی ہو' جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا منکر ہو' اسے مکمل اور برابر کی شہریت نہیں مل سکتی۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلم کی حیثیت ذمی کی ہے' لیکن ذمی گالی نہیں ہے۔ ذمی' ذمہ سے بنا ہے' ان کی حفاظت کی ذمہ داری ریاست لیتی ہے۔ انکی جان' مال' عزت و آبرو کی حفاظت' ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت' ان کے کاروبار اور ان کی املاک کی پوری حفاظت اسلامی ریاست کے ذمہ ہے۔ انہیں اپنے عقائد کے مطابق اپنے مذہب پر عمل کرنے' اپنی اولاد کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے اور اس کی تبلیغ و تلقین کا پورا اختیار ہے' اور اپنے پرسنل لاء کے مطابق نکاح طلاق وغیرہ کے معاملات طے کرنے کی پوری آزادی ہے' لیکن وہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کے عمل میں شامل نہیں ہو سکتے' اس لئے کہ اسلامی ریاست میں قانون سازی کا دارومدار کتاب وسُنّت پر ہے اور جو کتاب کو مانے نہ سنت کو' اللہ کو مانے نہ قرآن کو' اور نہ اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانے تو اسے قانون سازی میں کیسے شریک کیا جا سکتا ہے؟ کوئی عقل کی بات ہونی چاہئے' کوئی منطق کی بات سامنے آنی چاہئے۔ انہیں پبلک لاء میں اور لاء آف دی لینڈ کے معاملے میں اسلام کی بالادستی قبول کرنی پڑے گی۔ اسلامی

ریاست میں رہتے ہوئے ﴿یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ﴾ کے مطابق انہیں جزیہ بھی دینا ہو گا' جو ایک ٹیکس ہے۔ جس طرح مسلمان شہری زکوٰۃ ادا کریں گے اسی طرح غیر مسلم جزیہ ادا کریں گے۔ یہ اس حفاظت کے بدلے میں ہو گا جو انہیں اسلامی ریاست میں حاصل ہو گی۔ "جزیہ" جزا سے بنا ہے اور "ذمی" ذمے سے۔ یہ الفاظ کوئی گالی نہیں ہیں۔ ٹیکس کیا ہوتا ہے؟ بدل ہوتا ہے۔ آپ کی کارپوریشن سڑکیں بنا رہی ہے' انہیں مرمت کر رہی ہے' اس کے لئے پیسہ آخر کہاں سے لائے؟ ظاہر ہے آپ کو اس کا بدل دینا ہے۔ چنانچہ آپ وہیکل ٹیکس دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ اپنی حکومت کو پراپرٹی ٹیکس' ویلتھ ٹیکس اور نجانے کون کون سے ٹیکس دیتے ہیں۔ آج ہم سب زکوٰۃ نہیں دیتے' جزیہ دیتے ہیں۔ یہ سارے ٹیکس جزیہ ہی تو ہیں۔

مزید برآں اسلامی ریاست میں کوئی غیر مسلم قانون سازی کے علاوہ اعلیٰ سطح کی پالیسی میکنگ میں بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ اسلامی ریاست کا نظام یا خلافت کا نظام جب بھی قائم ہو گا تو اس کی اولین اور بلند ترین ترجیح اس نظام کی تصدیر ہو گی' یعنی اسے درجہ بدرجہ ساری دنیا میں نافذ کرنا۔ چنانچہ اس کی ساری پالیسیاں اس ایک نکتے کے گرد گھومیں گی۔ اس کے سارے وسائل میں ترجیح نمبر ایک یہی ہو گی کہ ہمیں دین کا پیغام پوری دنیا تک پہنچانا ہے۔ اور "شہادت علی الناس" کا فریضہ سرانجام دینا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کوئی غیر مسلم ہمارے اس مقصد کے اندر شریکِ کار نہیں ہو سکتا' وہ تو رکاوٹیں ڈالے گا' راستے بند کرے گا۔ ان دو امور (قانون سازی اور پالیسی میکنگ) کے سوا غیر مسلموں کے لئے باقی سب راستے کھلے ہوں گے۔ انہیں فنی ملازمتیں اور سرکاری ملازمتیں دی جا سکتی ہیں۔ یہ فوج میں بھی آ سکتے ہیں' لیکن بہرحال مذکورہ بالا دو سطحوں پر انہیں شریک نہیں کیا جا سکتا۔

تو یہ تین باتیں دنیا کے کسی بھی جمہوری نظام میں شامل کر لیجئے' چاہے وہ امریکہ کا نظام ہو' برطانیہ کا نظام ہو یا بھارت کا نظام ہو' وہ خلافت کا نظام بن جائے گا۔ یعنی اللہ کی حاکمیت' دستور سازی قرآن و سنت کے منافی نہ ہونے کی شرط اور ریاست کی مکمل شہریت صرف مسلمانوں کے لئے ہونا' جبکہ غیر مسلموں کی حفاظت کا ذمہ لیا جانا۔

چند مغالطے اور ان کی وضاحت

اس ضمن میں ذہنوں میں بڑے بڑے مغالطے اور الجھنیں (confusions) موجود ہیں' لہٰذا مجھے چند امور کی مزید وضاحت کرنی ہے۔

پہلا مغالطہ تو یہ ہے کہ اسلامی قانون تو موجود ہے' بس اسے نافذ کرنا ہے' لہٰذا قانون سازی کی کیا ضرورت ہے؟ میرے نزدیک اس سے بڑا احمقانہ خیال کوئی نہیں ہے۔ مستقبل کی اسلامی ریاست میں قانون سازی کا سکوپ بہت وسیع ہو گا اور قرآن و سنت کے حوالے سے نئی قانون سازی ہو گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حالات بدل چکے ہیں اور تمام مسائل کی صورت بدل چکی ہے۔ لہٰذا اب قانون سازی کے لئے اجتہاد کا عمل جاری ہو گا۔ اجتہاد کے میدان کی وسعت کا اندازہ آپ اس بات سے لگا سکتے ہیں کہ آج کے دور میں بجٹ سازی بہت بڑا کام ہوتا ہے۔ تو کیا قرآن و سنت میں کہیں لکھا ہوا ہے کہ کس کس مد میں کتنی کتنی رقوم تفویض کی جائیں؟ ظاہر ہے کہ اس کے لئے کوئی ادارہ چاہئے جو فیصلہ کرے۔ اسی طرح ریاست کے دوسرے شعبے ہیں جن کے لئے قانون سازی کی ضرورت ہے' لہٰذا جدید اسلامی ریاست میں اجتہاد کا عمل مسلسل ہو گا۔

اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ؟

اجتہاد کے بارے میں ایک دوسری غلط فہمی علامہ اقبال کے ان الفاظ کا غلط مفہوم لینے سے پیدا ہوئی ہے کہ "آج کے دور میں اجتہاد بذریعہ پارلیمنٹ ہو گا"۔ میرے نزدیک علامہ اقبال کی یہ بات بالکل درست ہے اگرچہ لوگوں نے اس کا مطلب غلط لیا ہے اور غلط طور پر بیان کیا ہے۔ اور بدقسمتی سے پسرِ اقبال اس غلط نظریئے کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ اس کو سمجھ لیجئے کہ اس کا مطلب کیا ہے جہاں تک اجتہاد کے عمل کا تعلق ہے اس کے لئے ظاہر بات ہے کہ صلاحیت درکار ہے۔ اس کے لئے علم' تقویٰ اور دین کا فہم ضروری ہے' لیکن اس کو آپ ناپ تول نہیں سکتے کہ کس میں کتنا تقویٰ ہے اور کس میں نہیں ہے۔ کسی شخص کے علّامہ اور ذہین و فطین ہونے کی علامت صرف سند یافتہ ہو جانا ہی تو نہیں۔

معلوم ہوا کہ اجتہاد ہر شخص کر سکتا ہے' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس کا اجتہاد نافذ ہو گا۔ فرض کیجئے کسی مسئلے پر میں بھی سوچتا ہوں' قرآن و سنت سے استدلال کرتا ہوں اور کوئی رائے بناتا ہوں کہ یہ مسئلہ جو پیدا ہوا ہے میری دانست میں اس کا حل قرآن و سنت کے مطابق یہ ہے۔ ایک دوسرے صاحب اس مسئلے پر غور و فکر کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ نہیں' اس کی بجائے یہ شکلیں بہتر ہوں گی۔ کوئی اور صاحب کہتے ہیں کہ نہیں' یہ ایسے ہونا چاہئے۔ اب سوال یہ ہے کہ کس کا اجتہاد نافذ ہو گا؟ قوتِ نافذہ کس کے پاس ہے؟ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ امام ابو حنیفہؒ سے کہا گیا کہ ہم آپ کو چیف جسٹس بنا دیتے ہیں' آپ کے اجتہاد از خود نافذ ہو جائیں گے' لیکن انہوں نے کورا جواب دے دیا کہ میں بھی مجتہد ہوں' اور میرے علاوہ بھی مجتہد ہیں' میں اپنے اجتہاد کو ریاست کی قوتِ نافذہ کے ذریعے نافذ نہیں کرنا چاہتا۔ اس پر آپؒ نے ماریں کھائیں' جیل میں گئے' لیکن حکومتی پیشکش کو قبول نہیں کیا۔ امام مالکؒ سے کہا گیا کہ آپ کی کتاب "موطا" کو کتابِ قانون کے طور پر نافذ کر دیتے ہیں' لیکن آپؒ نے اس سے انکار کیا۔ البتہ قاضی ابو یوسفؒ نے عہدۂ قضا قبول کر لیا' جو ظاہر ہے مصلحتِ امت میں کیا ہو گا۔ سوال یہ ہے کہ قاضی ابو یوسف اگر عہدۂ قضا قبول نہ کرتے تو ان کا اجتہاد کیسے نافذ ہوتا؟ ان کے پاس کونسا اختیار تھا؟ قاضی ابو یوسف کی رائے کی تنفیذ تو خلیفۂ عباسی کے اختیار کی مرہونِ منت تھی۔ سلطان تو وہ تھا (السُّلطان ظِلُّ اللّٰہ فِی الارض) اختیار تو اس کے پاس تھا' اس نے جسے چاہا منتخب کر لیا' جسے پی چاہیں وہ سہ اگن۔ اگر وہ قاضی ابو یوسف کو منتخب نہ کرتے تو کسی اور کو کر لیتے۔

دورِ ملوکیت ہی میں اجتہاد کی تنفیذ کی ایک اور مثال ہمیں صرف ۳۰۰ سال پہلے مل جاتی ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر بڑے نیک اور خدا ترس بادشاہ تھے۔ انہوں نے علماء کی ایک باڈی بنائی کہ وہ جدید حالات کے مطابق قانون کی تدوین کریں۔ اس کے نتیجے میں فتاویٰ عالمگیری مرتب ہو گئے۔ اس وقت یہ اہتمام نہیں کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے علاقوں سے تمام علماء کی رائے لی جاتی' مختلف فرقوں سے پوچھا جاتا' ان کے نمائندوں کو جمع کیا جاتا۔ بلکہ جو بھی ذمہ دار بیوروکریسی تھی اس نے معروف علماء کے نام تجویز کر کے بادشاہ کو ارسال کر دیئے اور ان علماء نے فتاویٰ مرتب کر دیئے۔ پھر یہ کہ ان کو مرتب کرنے والے

علماء از خود تو ان فتاویٰ کو نافذ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو "فتاویٰ عالمگیری" کہلاتے ہیں' اور جن بے چاروں نے بیٹھ کر خون پسینہ ایک کر کے یہ فتاویٰ مرتب کئے ہوں گے ان کے تو نام بھی کوئی نہیں جانتا۔

تو اجتہاد اور شے ہے' تنفیذِ اجتہاد اور شے ہے۔ میرے نزدیک علامہ اقبال کے مذکورہ بالا قول کا مفہوم یہ ہے کہ کس کا اجتہاد نافذ ہو گا اور کتابِ قانون کا جزو بنے گا' یہ فیصلہ اب پارلیمنٹ کرے گی۔ ورنہ تو سو بکھیڑے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اجتہاد کرنے والے علماء مختلف مکاتبِ فکر سے متعلق ہوں گے۔ وہ حنفی ہوں گے یا شافعی ہوں گے۔ دیوبندی' بریلوی یا اہلحدیث ہوں گے۔ اگر اجتہاد کی تنفیذ بھی ان کے حوالے کر دی جائے تو وہ "تھیوکریسی" بن جائے گی۔ اور مولانا گوہر رحمان صاحب نے اپنے کل کے خطاب میں بڑی پیاری بات کہی تھی کہ اسلام میں تھیوکریسی یا پاپائیت نہیں ہے۔ آپ ماہرین سے رائے لیجئے' علماء کی خدمات حاصل کیجئے۔ افراد اور سیاسی جماعتیں علماء کی خدمات حاصل کریں اور عدالت بھی ان کی خدمات حاصل کرے۔ لیکن قوتِ نافذہ ان کے ہاتھ میں نہ ہو۔ اگر قوتِ نافذہ اور اتھارٹی ان کے ہاتھ میں آئی تو یہ پاپائیت یا تھیوکریسی بن جائے گی' جو روحِ عصر کے تقاضے کے منافی ہے۔ روحِ عصر کا تقاضا ہے کہ قانون سازی میں عوام کی شرکت ضروری ہے' لہٰذا کونسا اجتہاد قانون کا درجہ حاصل کرے گا' کونسا اجتہاد نافذ ہو گا' اس کا فیصلہ عوامی نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ کرے گی۔ البتہ اس کے اوپر اعلیٰ عدالت موجود رہے گی۔ اگر کسی کا خیال ہو کہ پارلیمنٹ غلط نتیجے پر پہنچی ہے تو وہ عدالت میں جا کر اسے غلط ثابت کروا لے۔

اجتہاد کا دائرۂ کار

اجتہاد اور قانون سازی کے ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درج ذیل حدیث بہت اہم ہے' جو بڑی مختصر لیکن بہت جامع حدیث ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بجا طور پر دعویٰ ہے کہ "اُوتِیتُ جَوامِعُ الْکَلِمِ" (مجھے اللہ تعالیٰ نے بڑے جامع کلمات عطا کئے ہیں)۔ اور یہ حدیث اس کی بہترین مثال ہے۔ حضرت ابو سعید خدری

ﷺ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ عَلٰى اَخِيَتِهٖ يَجُوْلُ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى اَخِيَتِهٖ" (مسند احمد) یعنی "مؤمن کی مثال اس گھوڑے کی سی ہے جو کہ ایک کھونٹے سے بندھا ہوا ہے' وہ گھومتا پھرتا ہے اور پھر اپنے کھونٹے کی طرف لوٹ آتا ہے"۔ دیکھئے کتنی سادہ حدیث ہے۔ پہلے تو یہ سمجھئے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ جو اللہ ہی کو نہیں مانتا وہ مادر پدر آزاد ہے' جو چاہے کھائے پیئے' جو چاہے کرے۔ لیکن جس نے اللہ کو مان لیا' قرآن کو مان لیا' محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مان لیا اس پر کئی بندشیں عائد ہو گئیں کہ یہ کھا سکتا ہے یہ نہیں کھا سکتا' یہ پی سکتا ہے یہ نہیں پی سکتا' یہاں شادی کر سکتا ہے یہاں نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بندۂ مومن بالکل ایک گھوڑے کی طرح بندھا ہوا ہے اور اسے باندھنے والی شے اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے' کوئی سلطانی' کوئی ملوکیت یا کوئی جاگیرداری نہیں۔ اس حدیث میں اس حوالے سے بڑی خوبصورت تشریح آئی ہے کہ اسلام میں قانون سازی کا سکوپ کتنا ہے اور جمہوریت اور مذہب کا امتزاج کتنا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں فرض کیجئے کہ ایک گھوڑے کو آپ ایک وسیع میدان میں چھوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ وہ اس میدان میں کچھ بھاگے دوڑے' لیکن اس سے باہر نہ چلا جائے' چنانچہ آپ ایک سو گز لمبی رسی لے کر اسے کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں۔ آپ کے اس عمل سے سو گز کے نصف قطر کا ایک دائرہ وجود میں آ جائے گا' جس کے اندر اندر گھوڑا آزاد ہو گا کہ وہ دائیں' بائیں' شمال' جنوب' مشرق یا مغرب جس سمت میں چاہے چلا جائے۔ وہ چاہے تو پچاس گز جائے' ساٹھ گز جائے' سو ویں گز تک چلا جائے' لیکن اسے ایک سو ایک واں گز نہیں آئے گا' نہ مشرق میں' نہ مغرب میں' نہ شمال میں' نہ جنوب میں۔ یہ ہے پابندی اور آزادی کا حسین امتزاج۔ گویا بقول اقبال۔

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے' پا بہ گِل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے!

یہ دائرہ ہے حدود اللہ کا' جس کے بارے میں فرمایا گیا: لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔ اس دائرے سے آگے تو بڑھنا نہیں' کیونکہ بندھے ہوئے ہیں' لیکن اس سو

گز نصف قطر کے دائرے میں ہر طرف جانا مباح ہے' ہر قدم اٹھانا مباح ہے۔ چنانچہ اسلام میں مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ حدود تو چند ہیں۔ سود' جوا' خنزیر اور شراب کے علاوہ چند اور چیزیں حرام ہیں۔ چند رشتے حرام قرار دے دیئے گئے ہیں کہ ان سے نکاح نہیں کر سکتے۔ پھر جو عورت کسی کے نکاح میں ہو وہ حرام ہے' باقی جس مسلمان عورت سے چاہو شادی کر سکتے ہو' کروڑوں کے لئے مباح کا راستہ کھلا ہے۔ مباح اس لئے کہ شادی کے امکانات تو کروڑوں ہیں۔ چنانچہ مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور شریعت کا یہ اصول ہے کہ "ہر شے مباح ہے جب تک اس کی حرمت ثابت نہ ہو جائے"۔ یہ نہیں کہ "ہر شے حرام ہے جب تک اس کی حِلّت ثابت نہ ہو جائے"۔

مباحات کے اس دائرے کے اندر اسلام کی حسین ترین جمہوریت ہے' یہاں کثرتِ رائے سے فیصلہ کر لیجئے۔ آپ کو دو مباحوں میں فیصلہ کرنا ہے نہ کہ حلال اور حرام میں۔ آپ کو شراب اور شربت میں فیصلہ نہیں کرنا' روح افزا اور شربت صندل میں فیصلہ کرنا ہے۔ تو گنتی میں کیا حرج ہو گا؟ مباحات کے اس دائرے میں اکیاون فیصد لوگوں کی بات کیوں نہ مان لی جائے؟ اس میں کیا قباحت ہے؟ مباحات کے انتخاب میں جمہوریت کو بروئے کار لانے میں کیا قدغن' کیا خرابی اور کیا برائی ہے؟ البتہ یہ بات طے ہے کہ کسی حرام کو حلال نہیں کر سکتے۔ اکیاون فیصد تو کجا صد فی صد بھی نہیں کر سکتے۔ یہ وہ جمہوریت ہے جسے مولانا مودودی مرحوم نے "تھیوڈیموکریسی" سے تعبیر کیا ہے۔ میرے نزدیک فکرِ اسلامی کے مجدد علامہ اقبال ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی نے ان کے فکر کے بہت سے پہلوؤں' خاص طور پر اسلامی ریاست کے دستور اور اس کی بنیادوں کو بڑے پیمانے پر عام کیا ہے۔ چنانچہ میں مولانا مودودی کو اس دور کا سب سے بڑا مسلم پولیٹیکل سائنٹسٹ مانتا ہوں۔ لیکن میرے نزدیک وہ سیاستدان نہیں تھے کیونکہ سیاست دان ہونا اور ہے' پولیٹیکل سائنس اور سیاسیات کا ماہر ہونا اور ہے۔ مولانا سیاسیات کے بہت بڑے ماہر تھے' لیکن سیاستدان ہونے کی حیثیت سے ان کی صلاحیت بالکل صفر ثابت ہوئی' اس حیثیت سے ان کے اندازے اور ان کی امیدیں بالکل عبث ثابت ہوئیں۔ ۱۹۵۱ء میں جماعت اسلامی نے پہلی مرتبہ پنجاب کے الیکشن میں اپنے پنچائتی نظام کے تحت حصہ لیا' جس میں مولانا مودودی

چالیس سیٹوں کی امید لگائے بیٹھے تھے' جن میں سے ایک بھی ہاتھ نہ آئی۔ معلوم ہوا کہ معاشرے کا رجحان کچھ اور تھا' انہیں اس کا پتہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے سٹڈی روم کے اندر بیٹھے ہوئے پڑھتے تھے' لکھتے تھے' چاروں طرف کتابوں کے انبار تھے۔ اللہ اللہ اور خیر سلا۔ لیکن پولیٹیکل سائنٹسٹ کی حیثیت سے میں مولانا مودودی کو علامہ اقبال کا سب سے بڑا شارح مانتا ہوں اور مجھے جہاں کہیں بھی سیاسیات پر گفتگو کرنی ہوتی ہے وہاں ان کی وضع کردہ اصطلاحات کا ذکر ضرور کرتا ہوں۔ مولانا مودودی نے بالکل صحیح کہا ہے کہ اسلام نہ ڈیموکریسی ہے نہ تھیوکریسی ہے' بلکہ یہ تھیوڈیموکریسی ہے' یعنی دونوں کا امتزاج ہے۔ لیکن اس میں "تھیو" (theo) کا عنصر مذہبی طبقے پر مشتمل نہیں ہے' بلکہ یہ کتاب وسنت کے دائرے کا ہے اور ڈیموکریسی کا معاملہ کتاب وسنت کے اس دائرے کے اندر اندر ہے' جس کے لئے ﴿اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ﴾ کا اصول دے دیا گیا ہے۔ اللہ نے کسی شے کو حرام کر دیا تو تم اسے حلال نہیں کر سکتے' کسی کو حلال کر دیا تو تم اسے حرام نہیں کر سکتے' لیکن جن چیزوں کے بارے میں سکوت فرمایا ہے انہیں "اَمْرُ كُمْ" بنا دیا ہے' کہ ان کے بارے میں باہمی مشورے کرو۔ اور اس میں گنتی کے اندر قطعاً کوئی حرج نہیں۔ مولانا مودودی نے اس کے لئے حاکمیتِ عامہ (Popular Sovereignty) کی بجائے خلافتِ عامہ (Poplular Vicegerency) کی اصطلاح وضع کی ہے' اگرچہ اس میں بھی تھوڑی سی اصلاح کی ضرورت ہے' کیونکہ اسلام میں خلافت کا تصور عوام کی خلافت کا نہیں' مسلمانوں کی خلافت کا ہے۔

مشاورتِ باہمی کا نظام

اب اس مسئلے کی طرف آیئے کہ نظامِ خلافت میں مشاورتِ باہمی کا نظام کیا ہو گا اور اولی الامر کا انتخاب کیسے عمل میں آئے گا۔ اب وہ قبائلی نظام تو رہا نہیں۔ لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے اب ریفرنڈم اور انتخابات ہوتے ہیں' بیلٹ بکس رکھے جاتے ہیں' سیاسی پارٹیاں بنتی ہیں جو اپنے اپنے انتخابی منشور پیش کرتی ہیں' پھر وہ الیکشن میں جاتی ہیں۔ آخر کوئی نظام تو بنانا پڑے گا۔ خلیفۃ المسلمین آسمان سے تو نازل نہیں ہو گا' وہ مامور من

اللہ تو نہیں ہو گا۔ اولی الامر آسمان سے نہیں ٹپکیں گے' بلکہ انسانوں میں سے ہی چنے جائیں گے۔ اس بارے میں بھی یقیناً بڑے بڑے مغالطے ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ میرے نزدیک ہر بالغ مسلمان کو رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہئے' اگرچہ "بلوغت" کی عمر کا تعین جو بھی پارلیمنٹ بنے گی وہ کرے گی۔ میری رائے میں تو حقِ رائے دہی چالیس برس کی عمر میں ملنا چاہئے' جو قرآن کے نقطۂ نظر سے شعور کی عمر ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی ﴿ حَتّٰٓی اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ﴾ لیکن بہرحال یہ معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورے اور ان کی آراء سے طے ہو گا۔ اور یہاں نوٹ کر لیجئے کہ ووٹ دینے کا حق ہر مسلمان کو حاصل ہو گا' چاہے متقی ہو چاہے فاسق ہو۔ میں یہ باتیں لگی لپٹی رکھے بغیر کر رہا ہوں تاکہ ذہنوں میں موجود الجھنیں اور مغالطے ختم ہوں۔ اگر میں غلطی پر ہوں تو میری غلطی مجھ پر واضح کی جائے۔ ہر مسلمان کے لئے بلاامتیاز حق رائے دہی کے لئے میرے پاس دلیل امام اعظم ابو حنیفہؒ کا یہ فرمان ہے کہ "المُسلم کفؤ لکلِّ مسلمٍ" یعنی ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ہم مرتبہ ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں تمام مسلمانوں کے دستوری اور قانونی حقوق بالکل برابر ہیں' ان میں کوئی فرق نہیں۔ اگر ایک باپ کے دو بیٹے ہوں' ایک تہجد گزار ہو اور دوسرا فرض نماز بھی نہ پڑھتا ہو تو باپ کی وراثت میں سے دونوں کو برابر حصہ ملے گا' یہ نہیں ہو گا کہ اس متقی اور تہجد گزار کو 6 / 5 دے دو اور دوسرے کو صرف 6 / 1 پر ٹال دو۔ یا تو ثابت کیجئے کہ وہ کافر ہو گیا ہے تو اس کا کوئی حق سرے سے رہا ہی نہیں۔ یہاں تو "All or none law" پر عمل ہو گا' یعنی یا تو اس کے سارے حقوق قائم رہیں گے یا بالکل صفر ہو جائیں گے۔ جب تک وہ مسلمان ہے "المسلمُ کفؤ لکلِّ مسلمٍ" کی رو سے اسلامی ریاست میں اسے برابر کے حقوق حاصل رہیں گے۔

امیدواری کا مسئلہ

ایک بہت بڑا مغالطہ امیدواری کے مسئلے میں پیدا کیا گیا ہے اور اس کے پیدا کرنے میں بھی کچھ دخل مولانا مودودی کی انتہاپسندانہ طبیعت کو حاصل ہے۔ اس ضمن میں مغالطہ

یہ پیدا کیا گیا کہ "امیدواری حرام ہے" حالانکہ یہ صرف اخلاقی سطح پر حرام ہے نہ کہ قانونی سطح پر، بشرطیکہ آپ اپنے ذاتی اقتدار کے لئے کوشاں نہ ہوں۔ قرآن حکیم میں الفاظ وارد ہوئے ہیں: ﴿لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾ (القصص: ۸۳) تو اگر آپ ذاتی علو و سربلندی کے لئے اقتدار چاہ رہے ہیں تو امیدواری حرام ہے، لیکن اگر یہ بات نہیں ہے تو قانونی سطح پر یہ حرام نہیں ہے۔ اپنے موقف کی تائید کے لئے میرے پاس سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلافت کے فیصلے کے لئے ایک باڈی مقرر کر دی تھی جس میں عشرہ مبشرہ میں سے چھ سات افراد شامل تھے۔ ان میں سے سعید بن زیدؓ کو آپؓ نے ووٹ کا حق نہیں دیا، اس لئے کہ وہ بہنوئی تھے۔ اسی طرح اپنے بیٹے کو بھی اس میں شامل تو کر دیا لیکن اس کے بارے میں طے کر دیا کہ نہ اس کا ووٹ ہے، نہ وہ امیدوار ہو سکتا ہے اور نہ ہی منتخب ہو سکتا ہے۔ اب جو لوگ باقی رہ گئے ان میں سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر (رضی اللہ عنہما) دونوں نے کہا کہ ہم اس سے دست بردار ہوتے ہیں۔ ان دونوں حضرات نے جو دستبرداری اختیار کی تو وہ آخر کس شے سے کی؟ ان کی دستبرداری کے بعد باقی تین حضرات رہ گئے۔ یعنی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم۔ اب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف فرماتے ہیں کہ اگر تم دونوں اپنا معاملہ میرے حوالے کر دو تو میں بھی دستبردار ہوتا ہوں۔ علی اور عثمان (رضی اللہ عنہما) کے مابین آخر وہ کون سا معاملہ تھا؟ وہ یہ تو نہیں کہتے تھے کہ نہیں صاحب، ہمیں نہیں چاہئے، ہمیں نہیں چاہئے، آپ خلیفہ بن جایئے۔ یہ لکھنوی انداز تو ہمیں کہیں ملتا ہی نہیں۔

اگر کوئی شخص دیانتاً یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اندر صلاحیت موجود ہے اور وہ امت کی مصلحت اور دین کے مفاد میں کام کر سکتا ہے تو اس کو آگے آنا چاہئے اور اپنی خدمات پیش کرنی چاہئیں۔ البتہ اگر اس کی نیت میں فتور ہے اور وہ ذاتی اقتدار چاہتا ہے تو اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔ ان دونوں چیزوں کو گڈمڈ نہ کیجئے۔ Confusion اسی کا نام ہوتا ہے کہ دو چیزوں کو خلط مبحث کے انداز میں گڈمڈ کر دیا جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے شاہِ مصر سے خود کہا تھا: ﴿اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ

الْاَرْضِ اِنِّی حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ ﴾ (یوسف : ۵۵) یعنی "ملک کے خزانے میرے سپرد کیجئے' میں حفاظت کرنے والا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں"۔ مصر کے اندر قحط کی صورت میں جو بہت بڑی آفت آنے والی ہے اس کا انتظام کرنے کی اللہ تعالیٰ نے مجھے صلاحیت دی ہے' لہٰذا مجھے اس کا اختیار دیجئے۔ کسی شے کے اخلاقی اور قانونی پہلو کو گڈمڈ کرنا درست نہیں ہے۔ جیسے مثلاً کسی نے آپ کو تھپڑ مارا تو آپ کے لئے دو راستے کھلے ہیں۔ ایک روحانی راستہ ہے کہ اسے معاف کر دیں۔ دین میں اس کی بڑی ترغیب اور تاکید آئی ہے :

﴿وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾

(التغابن : ۱۴)

"اور اگر تم عفو و درگزر سے کام لو اور معاف کردو تو اللہ غفور و رحیم ہے"۔

دیکھئے کتنی تاکید ہو گئی' تین ہم معنی الفاظ آ گئے۔ لیکن دوسری جگہ فرمایا :

﴿وَلَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰاُولِی الْاَلْبَابِ﴾ (البقرہ:۱۷۹)

"ہوشمندو! تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے"۔

آج تم اسے چھوڑ دو گے جس نے تمہارے تھپڑ مارا تھا تو کل یہ کسی اور کو مارے گا۔ چنانچہ برائی کا شروع ہی میں قلع قمع کر دو (Nip the evil in the bud.) اور قصاص لو! تو یہ دونوں چیزیں اگرچہ قرآن میں ہیں لیکن دونوں کی حیثیت اور محل علیحدہ ہے۔ بالکل یہی معاملہ امارت کا ہے۔ اندازہ کیجئے کہ تقویٰ کے اعتبار سے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا کیا مقام ہو گا جن کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم خود فرما رہے ہیں کہ "مَنْ کَانَ یَسُرُّهٗ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی زُهْدِ عِیْسٰی فَلْیَنْظُرْ اِلٰی صَاحِبِیْ اَبِیْ ذَرٍّ" یعنی جس کسی کی خواہش ہو کہ حضرت عیسیٰ کا زہد اپنی آنکھوں سے دیکھے تو وہ میرے دوست ابوذر کو دیکھ لے! تقویٰ کی اس سے بڑی سند کیا ہو گی۔ لیکن حضور اسی دوست ابوذرؓ سے کہہ رہے ہیں کہ تم کمزور ہو' تم اس ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے کہ ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے لئے صرف زہد و تقویٰ ہی نہیں کچھ اور چیزیں بھی درکار ہیں۔ جہاں بینی اور جہاں بانی کے تقاضے ایک جیسے نہیں ہیں۔ زہد و تقویٰ میں فقرائے صحابہؓ سے بڑھ کر کون

ہو گا۔ ابو درداء' ابو ہریرۃ اور ابوذر سے بڑھ کر زہد کس کا ہو گا؟ لیکن فقہائے صحابہؓ اور ہیں۔ وہ ابو بکر و عمر ہیں' عثمان و علی ہیں' معاویہ اور عائشہ ہیں' رضی اللہ عنہم اجمعین۔

تاہم امیدواری کے ضمن میں یہ بات بہت اہم ہے کہ امیدوار کی مکمل طور پر سکریننگ بہت ضروری ہے۔ ایک شخص اس ملک اور ریاست کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے اپنی خدمات آفر کر رہا ہے تو وہ پہلے یہ بتائے کہ اس کے پاس یہ مال و اسباب آیا کہاں سے ہے؟ میرے پاس اس کی دلیل اسلام کے عدالتی نظام میں "تزکیۃ الشہود" کا عمل ہے۔ اسلامی عدالت میں کسی شخص کی گواہی اس وقت تک قبول نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ خود اس سکریننگ میں سے گزر نہ جائے۔ آپ کسی مقدمے میں گواہی دینے کے لئے آئے ہیں تو پہلے اپنا کچا چٹھا بتا دیجئے تا کہ یہ طے ہو جائے کہ آپ قابلِ اعتماد اور ثقہ بھی ہیں یا نہیں؟ آپ کی گواہی قبول ہو گی یا نہیں ہو گی۔ اسی طرح امیدوار سے سارے کھائے پئے کا حساب لیا جا سکتا ہے۔ امیدوار کے طور پر جو بھی آئے وہ اس پوری سکریننگ سے گزر کر آئے۔ پھر مسلمان عوام اس کے بارے میں اپنے ووٹ کا حق استعمال کریں۔

کثیر الجماعتی نظام

ایک اور مغالطہ یہ پیدا کیا جا رہا ہے کہ اسلامی ریاست میں کوئی پارٹی سسٹم نہیں ہو گا۔ حالانکہ قرآن و حدیث کی رو سے کوئی شے ایسی نہیں جو اسے حرام قرار دیتی ہو۔ میرے نزدیک کثیر الجماعتی نظام (Multi-party System) روح عصر کا تقاضا ہے اور اس کا تعلق بھی ان اداروں سے ہے جو مغرب میں عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔ اس میں ہرگز کوئی قباحت نہیں ہے کہ مختلف پارٹیاں وجود میں آئیں اور وہ اپنا اپنا منشور پیش کریں کہ ہم خارجہ پالیسی میں یہ تبدیلی لانا چاہتے ہیں' ہم ٹیکسیشن کے نظام میں یہ اصلاح کرنا چاہتے ہیں' ہم بجٹ allocations میں یہ چیزیں لانا چاہتے ہیں' ہم تعلیم بالغاں پر اتنا خرچ کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی کے دستور میں کتاب و سنت کے خلاف کوئی چیز پائی جائے تو اس کی اسی وقت گرفت کی جائے اور اسے عدالت کے روبرو پیش کیا جائے کہ یہ بدمعاش کیا کہہ رہا ہے۔ یہ تو دستور کی خلاف ورزی ہو گئی۔ جس طرح کتاب و سنت کی

حدود کے اندر رہتے ہوئے قانون سازی میں اجتہاد ہو گا اسی طرح سیاسی جماعتیں اپنے اپنے منشور مرتب کرتے ہوئے اجتہاد کریں اور پھر عوام کے سامنے جائیں۔ جس جماعت کو عوام منتخب کر لیں وہ حکومت بنائے۔ البتہ پارٹی وِہپ (Party Whip) صرف ایک درجے میں صحیح ہو گی۔ پارٹی وِہپ اسے کہتے ہیں کہ کسی بھی مسئلے میں آپ کی ذاتی رائے دیانتاً چاہے پارٹی کے موقف کے خلاف ہے لیکن پھر بھی آپ اس کے حق میں رائے دینے پر مجبور ہیں۔ میرے نزدیک یہ خیانت ہے' بددیانتی ہے' جھوٹ ہے' جس کی اسلام میں قطعاً اجازت نہیں ہے۔ پارلیمنٹ میں ہر شخص کو اپنی رائے آزادانہ طور پر دینے کا حق حاصل ہونا چاہئے۔ البتہ اگر کوئی مسئلہ جماعتی منشور سے متعلق ہو جس کی بنیاد پر آپ الیکشن لڑ کر آئے ہیں تو اس کا معاملہ جدا ہے۔ اگر اس کے بارے میں آپ کی رائے بدل گئی ہے تو پھر آپ کے لئے مستعفی ہونا لازم ہو گا۔

والیانِ امر کے خلاف الزام تراشی

دورِ جدید کی اسلامی ریاست میں ایک ایسے خود مختار ادارے کا قیام بھی لازمی وِلابدی ہے جو والیانِ امر کے خلاف اٹھائے جانے والے اعتراضات اور ان پر عائد کئے جانے والے الزامات (impeachment) کا جائزہ لے اور الزامات ثابت نہ ہو سکنے کی صورت میں الزام تراشی کرنے والے افراد کو سزا دے۔ الزام تراشی کی بدترین مثال ہمیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف عبداللہ بن سبا کی ملتی ہے جس نے پروپیگنڈے کا طوفان کھڑا کر دیا تھا کہ یہ خائن ہیں' انہوں نے سارے مناصب اپنے رشتہ داروں کو دے دیئے ہیں' یہ کنبہ پروری کر رہے ہیں' بیت المال میں خیانت کر رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ حضرت عثمانؓ اپنی صفائی دے رہے ہیں' لیکن اس کا فیصلہ کون کرے؟ کہاں جائیں؟ حضرت علیؓ نے بھی حضرت عثمانؓ کی طرف سے صفائی دے دی لیکن وہ بھی کوئی ادارہ تو نہیں' یہ ان کی ذاتی رائے ہے۔ حضرت طلحہؓ و زبیرؓ بھی صفائی دے رہے ہیں' لیکن وہ بھی کوئی ادارے کی حیثیت نہیں رکھتے' لہٰذا اس کے لئے ایک ادارہ چاہئے جہاں فیصلہ ہو۔ اگر وہ ادارہ موجود ہو تو "Nip the evil in the bud" کے مصداق فتنہ آغاز ہی میں فرو ہو جائے

اور اگر ایسا کوئی ادارہ نہیں ہے تو فتنے کی آگ کو روکنے کی کوئی شکل موجود نہیں ہے۔ کوفے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کیا پتہ کہ مصر کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ فتنہ پردازوں نے آکر جو چاہی بکواس بیان کر دی کہ عمرو بن العاص تو ایسا ہے' ایسا ہے۔ نہ کوئی ٹیلی کمیونیکیشن ہے نہ کوئی ریڈیو ہے۔ آج جدید ذرائع ابلاغ کے ہوتے ہوئے ہمارا حال یہ ہے کہ شہر کے ایک علاقے میں کوئی بات ہو جائے تو دوسرے علاقے میں پتہ نہیں چلتا کہ اصل واقعہ کیا ہوا ہو گا۔ صحیح خبر نہیں پہنچتی' افواہیں پھیل جاتی ہیں۔ آج کے دور کا یہ حال ہے تو اس دور کا تصور کیجئے۔ اگر کوئی ادارہ موجود ہوتا تو ساری الزام تراشیوں کی تحقیقات ہوتیں' جن کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ کو بری قرار دیا جاتا اور الزام تراشی (impeachment) کرنے والوں کو قرار واقعی سزا دی جاتی' جس طرح کسی پر زنا کا الزام عائد کرنے کے بعد چار عینی گواہ پیش نہ کرنے والے کے لئے قذف کی سزا ۸۰ کوڑے ہیں۔ اسلامی ریاست میں خلیفۂ وقت کو بھی ایک عام شہری کی طرح عدالت میں حاضر ہو کر اپنے خلاف عائد کئے جانے والے الزامات کی جوابدہی کرنا ہو گی۔ اگر بے بنیاد الزام تراشی کرنے والوں کو سزا نہ دی جائے تو خلیفہ تو ہر وقت عدالتوں کے چکر میں ہی رہے گا۔ لہٰذا یہ اہتمام ضروری ہے تاکہ ہر شخص ذرا سوچ سمجھ کر قدم اٹھائے کہ اگر میں الزامات ثابت نہ کر سکا تو شامت میری آجائے گی۔

(جاری ہے)

Knowledge-Morality Nexus

A Collection of Articles on the Relationship between Knowledge and Morality --
an important theme in Muslim philosophy and theology

Edited By: Dr. Absar Ahmad

Price Rs. 200/-
Available from: Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an
36-K, Model Town, Lahore-54700

نکاح، طلاق اور حلالہ

قرآن و حدیث کی روشنی میں

پروفیسر عبداللہ شاہین

میاں بیوی کا تعلق درحقیقت انسانی زندگی اور تمدن کی جڑ اور بنیاد ہے۔ عورت اور مرد کے تعلق کی درستی پر پورے معاشرے کی درستی کا انحصار ہے اور اس کی خرابی پر پورے انسانی تمدن کی خرابی کا مدار ہے۔ اس لئے وہ شخص بہت بڑا فسادی ہے جو اس جڑ کو کاٹتا اور اس بنیاد کو بگاڑتا ہے اور اس طرح پورے خاندان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ شیطان اپنے مرکز سے زمین کے ہر حصے میں اپنے چیلے بھیجتا ہے جو واپس آکر اپنی کارروائیاں سناتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے میں نے فلاں بگاڑ پیدا کیا، کوئی کہتا ہے میں نے فلاں فساد برپا کیا۔ مگر ابلیس سب سے کہتا ہے تو نے کچھ نہ کیا۔ پھر ایک آتا ہے اور اطلاع دیتا ہے کہ میں ایک عورت اور اس کے شوہر میں جدائی ڈال آیا ہوں۔ یہ سن کر ابلیس اس کو گلے لگا لیتا ہے اور کہتا ہے کہ تو واقعی کارنامہ کر کے آیا ہے!

قرآن مجید نے ایسے پیروں، فقیروں، جادوگروں، عاملوں اور تعویذ گنڈے کرنے والوں کا ذکر کیا ہے جن کے عملیات، نقوش اور تعویذات پر لوگ ٹوٹے پڑتے تھے اور جو لوگوں کو عموماً ایسی باتیں سکھاتے یا ایسے ٹونے ٹوٹکے فراہم کرتے تھے جن سے وہ شوہر بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ بقولہٖ تعالیٰ :

﴿فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ﴾

(البقرہ:۲۰۱)

"یہ لوگ وہ چیز سیکھتے تھے جس سے شوہراور بیوی میں جدائی ڈال دیں"
گویا سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس کے ذریعے شوہر سے بیوی کو الگ کیا جاسکے۔ آج بھی آپ ہمارے معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ جوتشیوں' رملیوں' نجومیوں' جوگیوں اور دم کرنے والوں کے پاس اکثر ان عورتوں کا ہجوم ہوتا ہے جو ساس' بہو' نند' بھاوج اور میاں بیوی کو زیر و زبر کرنے کے لئے نقش اور تعویذ حاصل کرتی پھرتی ہیں۔

لیکن اسلام کی تعلیمات کا اصل رخ میاں بیوی کو عمر بھر کے لئے جوڑنا ہے' کیونکہ اسے ختم کرنے کا اثر صرف میاں بیوی پر ہی نہیں پڑتا بلکہ نسل و اولاد کی تباہی و بربادی اور بعض اوقات خاندانوں اور قبیلوں تک میں فساد کی نوبت پہنچتی ہے۔ اس لئے اسلام نے "طلاق" کی حوصلہ افزائی نہیں کی بلکہ جہاں تک ہو سکے اس سے روکا ہے۔ اور انتہائی مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی ہے۔ حدیث میں ہے :

مَا اَحَلَّ اللّٰہُ شَیْئًا ابغض الیہِ مِنَ الطَّلاق (ابوداؤد)

"اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال اور جائز چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ طلاق ہے"۔

اور حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا :

"نکاح کرو اور طلاق نہ دو' کیونکہ طلاق سے عرشِ رحمٰن ہل جاتا ہے"۔

تمام امتِ مسلمہ کا اتفاق ہے کہ نکاح اگرچہ ایک عمرانی' سماجی اور معاشرتی معاہدہ اور ایک مرد و عورت کے باہمی ایجاب و قبول کا نام ہے تاہم اس کی حیثیت ایک سنت اور عبادت کی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے : اَلنِّکَاحُ مِن سُنَّتِی (ابن ماجہ) "نکاح کرنا میری سنت ہے"۔ نیز فرمایا : وَمَنْ رَغِبَ عَن سُنَّتِی فلَیس مِنّی (متفق علیہ) "جس نے میری سنت سے منہ موڑا پس وہ میری امت سے ہی نہیں ہے"۔

مزید برآں نکاح کو نصف ایمان قرار دیتے ہوئے فرمایا :

اِذَا تزوّج العبدُ فقد استکمَلَ نِصفَ الدِّینِ فلْیَتّقِ اللّٰہَ فِی النّصفِ البَاقِی (بیہقی)

"جب بندے نے بیاہ کر لیا تو اس نے آدھا دین مکمل کر لیا۔ اب اسے باقی آدھے کے لئے اللہ کا خوف کرتے ہوئے پرہیزگاری اختیار کرنی چاہئے"۔

یعنی شادی کرنے سے انسان کا آدھا ایمان تو خود بخود مکمل ہو جاتا ہے اور شریکِ حیات کے شریکِ آرزو ہونے کے باعث نگاہ کی پاکیزگی حاصل ہو جاتی ہے اور عمومی طور پر انسان قلب و نظر کی خیانت سے بچ جاتا ہے۔

نگاہ کی پاکیزگی کے حصول کے لئے طبیبِ قلوب، رب کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نسخہ کیمیا بھی بتایا ہے کہ

يَا معشرَ الشَّباب مَنِ اسْتَطاع مِنْكُمُ البَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَإِنَّهُ اغضُّ لِلبَصَرِ واحصَنُ لِلفَرجِ ومَن لم يَسْتطِعْ فعَليهِ بالصَّومِ فَانَّه لهُ وِجَاءٌ (بخاری و مسلم)

"اے نوجوانو! تم میں سے جو شادی کی استطاعت رکھتا ہو تو اسے شادی کر لینی چاہئے۔ پس نکاح نظروں کو نیچا رکھنے والا اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے والا ہے اور جو بیاہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے روزہ رکھنا چاہئے۔ پس روزہ اس کی شہوت کو کم کرنے والا ہو گا"۔

پھر یہ خوش خبری ارشاد فرمائی :

مَا مِن مسلِمٍ ينظُرُ الٰی محاسِنِ امرءةٍ اوّل ثم يغضُّ بصَرَهُ الّا احدثَ اللّٰهُ عبادةً تجدُ حلاوتَها (احمد)

"جس مسلمان کی نظر کسی مسلمان عورت پر پڑے، پھر وہ اپنی نظر کو جھکا لے تو اللہ تعالیٰ اسے ایسی عبادت کا موقع عطا فرمائے گا جس سے اسے مزہ آئے"۔

اور اگر کبھی بشری تقاضا سے کسی نامحرم عورت کی طرف اٹھنے والی نگاہ سے کسی فتنہ یا لغزش کا احتمال پیدا ہونے لگے تو دنیا کے سب سے بڑے ماہر نفسیات و معالج خاص (Specialist)، نبی عفت مآب ﷺ نے یہ حکیمانہ ارشاد فرمایا :

ايّما رجلٍ رآی امرءةً تُعجِبهُ فليقُمْ الٰی اهلهِ فانَّ معهَا مِثلَ الّذی معَها (دارمی)

"جس شخص کو کوئی عورت اچھی معلوم ہو' وہ فوراً اپنے گھر چلا جائے اور اپنی بیوی سے صحبت کرلے۔ اس لئے کہ اس کے پاس بھی وہی چیز ہے جو اس عورت کے پاس ہے"۔

نیز اس نازک جذباتی مرحلہ پر بیوی کے پاس جانے سے نہ صرف نفسیاتی و جنسی علاج ہوتا ہے بلکہ دنیا کے سب سے سچے اور فطری مذہب "اسلام" کو لانے والی ہستی ﷺ نے یہ بشارت بھی سنادی کہ اس عمل خیر سے جنسی تسکین کے علاوہ انسان عنداللہ محبوب و ماجور بھی ہوتا ہے۔ فرمایا:

"بیوی سے مجامعت کرنا صدقہ ہے"۔ صحابہؓ نے یہ سن کر پوچھا۔ "یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم میں سے ایک آدمی اپنی شہوت پوری کرتا ہے اور اس میں بھی ثواب ملتا ہے؟" آپؐ نے فرمایا۔ "یہ تو بتلاؤ کہ اگر وہ حرام کاری سے اپنی شہوت پوری کرتا تو اس پر گناہ ہوتا یا نہیں؟" اسی طرح اس کا حلال طریقہ پر شہوت پوری کرنا موجبِ ثواب ہے"۔ (مسلم)

اسلام کی ان ساری تعلیمات کا مقصدِ وحید یہ ہے کہ معاشرہ جنسی بے راہ روی اور انتشار کا شکار نہ ہو اور آزادانہ شہوت رانی اور چوری چھپے کی آشنائیوں {۱} کی نوبت نہ آئے۔

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ (المائدہ:۵)

"پاک دامن مؤمن عورتیں اور پاک دامن اہلِ کتاب عورتیں بھی (حلال ہیں) جبکہ تم ان کا مہر دے دو اور ان سے عفت قائم رکھنی مقصود ہو نہ کہ کھلی بدکاری کرنی اور نہ ہی چھپی دوستی کرنی"۔

پھر فرمایا:

﴿ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ

بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخْدَانٍ﴾ (النساء : ۲۵)

"پس ان کے ولی کی اجازت سے ان کے ساتھ نکاح کرلو اور معروف طریقہ سے ان کے مہر ادا کردو' تا کہ وہ شادی شدہ ہونے کے باعث محفوظ ہو کر رہیں' آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں اور نہ ہی چوری چھپے یاریاں لگاتی پھریں"۔

گویا قرآن و حدیث سے ثابت ہوا کہ اسلام ایک مکمل اور پاکیزہ نظام حیات کا نام ہے' جس میں خالق کائنات کی طرف سے انسانی فطرت میں رکھے ہوئے شہوانی جذبات پر پابندی کی بجائے ان کی تسکین کا بہترین اور عفت مآب سامان موجود ہے۔ یہ ایک عبادت ہونے کے باعث کارِ ثواب بھی ہے اور اس سے انسانی معاشرے کی مضبوط اور صحت مند بنیاد بھی پڑتی ہے۔

البتہ وہ لوگ جو (نعوذ باللہ) خدا اور مذہب سے بیزار یا بے نیاز ہیں' وہ شادی بیاہ کے معاملہ کو بھی عام لین دین اور شراکت داری کی طرح باہمی رضامندی سے طے ہو جانے والا ایک عام معاملہ قرار دیتے ہیں جس کا مقصد شہوت براری کے علاوہ کچھ نہیں۔ اس نظریئے نے انسانوں کو جنگل کے جانوروں کی صف میں کھڑا کر دیا ہے' جس سے جنسی بے راہ روی عام ہوئی ہے۔ اسی نظریہ کے باعث مغرب میں لوگ "انسانی حقوق" "آزادئ فکر" اور "حریتِ عمل" کے نام نہاد نعرہ پر یہاں تک چلے گئے ہیں کہ باہمی رضامندی سے اگر ایک مرد اور ایک عورت زنا کر رہے ہیں تو یہ کوئی جرم نہیں۔ افسوس کہ ہمارے معاشرے میں بھی کچھ ایسے مغرب زدہ لوگ ہیں جو استعارے اور کنائے کی زبان میں بڑے فخر سے کہتے ہیں : "جب بازار میں دودھ عام ملتا ہو تو گائے کو کون گھر میں باندھے!" اس طرح وہ نکاح کے پاکیزہ عمل سے اعراض کرتے ہوئے آزاد شہوت رانی کو فروغ دینا چاہتے ہیں۔ مگر اسلام نے اس مادر پدر آزادی کے تصور کی مذمت کی ہے اور عفت سامانی و وفاشعاری کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا :

تَزَوَّجُوا وَلَا تُطَلِّقُوا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الذَّوَّاقِيْنَ

وَالذَّوَّاقَاتِ (الحدیث)

"نکاح کرو اور طلاق نہ دو کیونکہ اللہ تعالیٰ ایسے مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو (بھونرے کی طرح پھول پھول کا) مزا چکھتے پھرتے ہیں"۔

غرضیکہ اسلام کا منشا یہ ہے کہ نکاح کا معاملہ عمر بھر کے لئے رہے۔ لیکن اگر میاں بیوی میں ناموافقت کی صورت پیدا ہو جائے تو پہلے سمجھانا بجھانا ہے' پھر ڈانٹ ڈپٹ' اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو خاندان کے چند افراد کو ثالث بنا کر معاملہ طے کرنا ہے۔ بقولہٖ تعالیٰ

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا﴾ (النساء : ۳۵)

"اور اگر تم کو معلوم ہو کہ میاں بیوی میں اَن بَن ہے تو ایک منصف مرد کے خاندان میں سے اور ایک منصف عورت کے خاندان میں سے مقرر کرو"۔

اس کی مصلحت یہ ہے کہ اگر معاملہ خاندان سے باہر چلا جائے تو بات بڑھ جانے اور دلوں میں زیادہ رنجش پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ لیکن بعض اوقات اصلاحِ احوال کی تمام کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں اور میاں بیوی کا باہم مل کر رہنا ایک عذاب بن جاتا ہے۔ ایسی حالت میں تعلق ختم کر دینا ہی راحت اور سلامتی کی راہ ہو جاتی ہے اور بقول شاعر ع "چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں" کا مصرع ہی صادق آتا ہے۔ لیکن محض غصہ نکالنے اور انتقامی جذبات کا کھیل بنانے کے لئے نہیں بلکہ یہ مرحلہ انتہائی عمدگی اور حسن معاملہ کے ساتھ طے ہونا چاہئے۔ شاعری کی زبان میں یوں کہئے کہ۔

وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے اِک خوبصورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا

کیونکہ قرآن مجید میں جہاں بھی طلاق کا ذکر آیا ہے' احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ کہیں فرمایا :

﴿فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ﴾ (البقرہ : ۲۲۹)

"یا تو عورت کو سیدھی طرح رکھ لیا جائے یا بھلے طریقے سے اس کو رخصت کر دیا جائے"۔

کسی مقام پر فرمایا :

﴿فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْفَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾

(الطلاق : ۲)

"پس یا تو ان کو معروف طریقہ سے رکھ لو یا عمدہ طریقہ سے رخصت کردو"۔

اور کہیں ارشاد ہوا :

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْسَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ (البقرہ : ۲۳۱)

"اور جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور ان کی عدت پوری ہونے کو آ جائے تو یا تو بھلے طریقے سے انہیں رکھ لو یا عمدہ طریقے سے رخصت کردو"۔

بہرحال جس طرح شریعت اسلامی نے نکاح کے معاملے اور معاہدے کو ایک عبادت کی حیثیت دے کر عام معاہدات سے بلند سطح پر رکھا ہے' اسی طرح اس معاملہ کا ختم کرنا بھی آزاد نہیں رکھا کہ ع

جب تک چاہا دل سے کھیلا اور جب چاہا توڑ دیا

بلکہ اس کے لئے ایک حکیمانہ قانون اور ضابطہ بنایا ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے امتِ مسلمہ کے مَردوں کو فرمایا گیا :

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ﴾

(الطلاق : ۱)

"اے نبیؐ! جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دینے لگو تو ان کی عدت کے مطابق ان کو طلاق دو"۔

گویا قانونِ طلاق کا آغاز اس طرح فرمایا گیا ہے کہ اس کا اختیار مرد کو دیا گیا ہے جس میں فطرتاً برداشت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن عورت بھی اس حق سے بالکل محروم نہیں کہ وہ کسی ظالم شوہر کے ظلم و ستم سہنے پر مجبور ہو جائے اور علیحدگی اختیار نہ کر سکے۔ بلکہ اس کو حق دیا گیا ہے کہ حاکم وقت کی عدالت میں اپنا معاملہ پیش کر کے طلاق حاصل کر سکے۔ اسے اسلامی اصطلاح میں "خلع" کہتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسے صرف حق مہر چھوڑنا پڑتا

ہے۔

لیکن جس طرح مرد کے لئے طلاق کے اختیار کو استعمال کرنا اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ ہے اور صرف مجبوری کی حالت میں آخری اقدام کے طور پر اس کی اجازت ہے' اسی طرح جو عورت بلاوجہ اپنے خاوند سے "خلع" طلب کرتی یعنی طلاق مانگتی ہے اس کے بارے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

"جو عورت بلاوجہ اپنے شوہر سے طلاق مانگے اس پر جنت کی خوشبو بھی حرام ہے"۔ (احمد' ترمذی' ابوداؤد' ابن ماجہ' داری)

قانون طلاق میں دوسری مصلحت یہ اختیار کی گئی ہے کہ غصے کی حالت میں یا کسی وقتی اور ہنگامی ناگواری میں اس اختیار کو استعمال نہ کیا جائے۔ اسی حکمت کے ماتحت حالتِ حیض میں طلاق دینے سے منع کیا گیا ہے' کیونکہ ان دنوں میاں بیوی میں باہم کشش نہیں ہوتی اور عورت کا مزاج بھی طبی نقطہ نظر سے اعتدال پر نہیں ہوتا۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) نے اپنی بیوی کو حالتِ حیض میں طلاق دے دی۔ حضرت عمرؓ نے رسول اکرم ﷺ سے اس کا ذکر کیا۔ آپؐ سن کر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا "اس کو حکم دو کہ بیوی سے رجوع کرلے اور اسے اپنی زوجیت میں روکے رکھے' یہاں تک کہ وہ حیض سے فارغ ہو کر پاکیزہ ہو جائے۔ اس کے بعد اگر وہ طلاق دینا چاہے تو بغیر مباشرت کے طلاق دے دے"۔

یاد رہے کہ پاکیزگی کی حالت میں بھی اگر ہم بستری ہو چکی ہے تو اس دوران میں طلاق دینے کی ممانعت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ممکن ہے وہ حاملہ ہو چکی ہو۔ اور چونکہ حاملہ عورت کی مدتِ عدت "وضع حمل" یعنی بچے کی پیدائش تک ہے اس طرح اس کی مدت عدت طویل ہو جائے گی جس سے اس کو تکلیف ہوگی۔

یہی حکم باری تعالیٰ مذکورہ بالا آیت مبارکہ "فَطَلِّقُوهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ" میں دیا گیا ہے یعنی عورتوں کو ان کی عدت کا خیال رکھ کر طلاق دو۔ پھر حکم ربانی ہوا۔

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ ﴾

(البقرہ : ۲۲۹)

"طلاق دو مرتبہ ہے۔ پھر یا تو عورت کو بھلے طریقے سے روک لیا جائے یا (تیسری مرتبہ طلاق دے کر) بھلے طریقے سے رخصت کر دیا جائے"۔

یعنی نکاح کا معاملہ ایک دم ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے تین درجے' تین طلاقوں کی صورت میں رکھے گئے ہیں' جو ہر مہینے ایک طلاق دے کر تین مہینوں میں مکمل ہونے چاہئیں۔ مذکورہ بالا آیت کریمہ کے لفظ "مَرَّتَانِ" میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ طلاق دینے کا اصل شرعی طریقہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاق تک نوبت پہنچا دی جائے۔ اور وہ بھی بیک وقت اور بیک لفظ نہ ہوں بلکہ دو طہروں (پاکیزگی کی حالت میں دو مہینوں) میں الگ الگ ہوں۔ پھر تیسرے طہر (مہینے) میں یا تو بیوی کو تیسری طلاق دے کر بھلے طریقے سے رخصت کر دیا جائے یا عمدگی سے صلح و صفائی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے گھر کے اندر رکھ لیا جائے۔

رہی یہ صورت کہ ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دے ڈالی جائیں' جیسا کہ آج کل دین سے بے پروائی اور اس کے احکام سے غفلت کی بنا پر جاہلوں کا عام طریقہ ہے' بلکہ عدالتوں میں بعض پڑھے لکھے عرائض نویس بھی تین طلاق سے کم کو گویا طلاق ہی نہیں سمجھتے' تو یہ سخت گناہ ہے۔ حدیث میں امام نسائی نے بروایت محمود بن لبید نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایک شخص کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی تھیں۔ آپؐ غصہ میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا:

اَیُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰہِ وَاَنَا بَیْنَ اَظْھُرِکُمْ

"کیا اللہ کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں"۔

ایک صحابیؓ نے عرض کیا: حضورؐ میں اس شخص کو قتل نہ کر دوں؟ (یعنی صحابیؓ کو بھی یہاں تک غصہ آیا)

امام طحاوی نے ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کے پاس آیا اور اس نے کہا۔ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا:

انّ عمّک عصی اللّٰہ فاٰثم واطاع الشّیطان

"تیرے چچا نے اللہ کی نافرمانی کی اور گناہ کا کام کیا اور شیطان کی پیروی کی"۔

اور حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے دیتا تھا آپؓ اس کو دُرے لگاتے تھے۔

گویا طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے' یہ ہے کہ عورت کو حالتِ طہر (پاکیزگی) میں' جس میں جماع نہ کیا ہو' ایک طلاق دی جائے' پھر اگر شوہر چاہے تو وہ دوسرے طہر (دوسرے مہینے) میں دوبارہ ایک طلاق دے دے۔ ورنہ بہتر اور پسندیدہ یہی ہے کہ پہلی طلاق پر ہی اکتفا کرے۔ اس صورت میں شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے کہ عدت (یعنی تین مہینے) گزرنے سے پہلے پہلے جب چاہے رجوع کرلے اور اگر عدت گزر بھی جائے تو موقع باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دونوں دوبارہ نکاح کرلیں۔ لیکن اگر تیسری طلاق بھی دے دی جائے' تو نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ ہی اس کا موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔

اس صورت میں اکثر و بیشتر تین طلاقیں دینے والے بعد میں پچھتاتے اور مصیبت جھیلتے ہیں' خصوصاً جب کہ صاحبِ اولاد بھی ہوں۔ اب وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح بیوی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے انتہائی آسانی کا سامان فراہم کیا تھا کہ وہ ایک ایک کرکے الگ الگ طہر میں طلاق دیں۔ اس دوران میں مصالحت کی راہیں کھلی تھیں اور سوچ بچار کا خوب موقع تھا۔ اگر بیوی کی کچھ عادات ناپسند تھیں تو بیوی سے ملنے والی راحتوں' اولاد کی پرورش اور گھر کے انتظام کی سہولتوں کی طرف ہی توجہ چلی جاتی اور رجوع کا فیصلہ ہو جاتا۔ مگر اب اس نے اپنے سارے اختیارات' شریعت کی دی ہوئی آسانیوں کو نظرانداز کرکے' ختم کردیئے۔

اب اگر دونوں میاں بیوی راضی ہو کر آپس میں دوبارہ نکاح کرنا بھی چاہیں تو جب تک بیوی کا نیا نکاح (عدت پوری کرنے کے بعد) کسی دوسرے مرد سے نہ ہو جائے۔ پھر اتفاق سے وہ مرد اپنی مرضی [۲] سے کبھی طلاق دے دے یا فوت ہو جائے تو (عدت پوری کرنے کے بعد) پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے' وگرنہ نہیں۔ کیونکہ شریعت کا حکم یہ ہے :

﴿فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا﴾ (البقرہ : ۲۳۰)

"پھر اگر (قطعی) طلاق دے دی جائے تو وہ عورت اس کے لئے حلال نہ ہوگی سوائے اس کے کہ اس کا نکاح کسی دوسرے شخص سے ہو۔ پھر اگر وہ (دوسرا شخص) بھی اسے طلاق دے دے تو ان دونوں (یعنی عورت اور پہلے شوہر) پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ باہم رجوع کرلیں"۔

اس موقع پر تین طلاقیں دینے والے ایک "چور دروازے" کا بندوبست کرتے ہیں۔ یعنی کسی پیشہ ور مولوی سے "حلالہ" کا فتویٰ لیتے ہیں' پھر ایک مرد کو وقتی نکاح کے لئے تیار کرتے ہیں اور سوچی سمجھی سکیم کے تحت عورت کو چند دنوں کے لئے اس کے نکاح میں دے دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ پرلے درجے کی بے حیائی بھی ہے کہ عورت کو محض حلال اور جائز کرنے کے لئے کسی سے اس کی عصمت دری کرائی جائے۔ ایسے شخص کو حضور ﷺ نے "کرائے کا سانڈ" اور لعنتی فرمایا ہے اور ایسے نکاح کو "سازشی نکاح"{۳} قرار دیا ہے۔ حدیث میں حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مروی ہے کہ رسول پاکؐ نے صحابہؓ سے پوچھا: اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِالتَّیْسِ الْمُسْتَعَارِ؟ "کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ کرائے کا سانڈ کون ہوتا ہے؟" صحابہؓ نے عرض کیا' ضرور ارشاد فرمائیں۔ فرمایا: هُوَ الْمُحَلِّلُ... "وہ حلالہ کرنے والا ہے" لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ... "اللہ تعالیٰ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا' دونوں پر لعنت فرمائی ہے"۔ (ابن ماجہ' دار قطنی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَعَنَ اللّٰهُ الْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهُ... "اللہ تعالیٰ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لئے حلالہ کیا گیا' دونوں پر لعنت فرمائی ہے"۔ (ترمذی' نسائی)

ایک روایت میں ہے کہ یہ نکاح ہی نہیں جس میں باطن کچھ ہے اور ظاہر کچھ ہے' جس میں خدا کی کتاب سے مذاق اور ہنسی{۴} ہے۔ نکاح صرف وہی ہے جو رغبت کے ساتھ ہو۔ (ابن کثیر)

مستدرک حاکم میں ہے کہ ایک شخص نے از خود اپنے بھائی کے لئے "حلالہ" کی غرض سے نکاح کیا۔ پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس نکاح کے متعلق فتویٰ پوچھا تو حضرت عبداللہؓ نے فرمایا : ہم ایسے نکاح کو حضورؐ کے زمانہ میں "زنا" شمار کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہاں تک فرمایا کہ جو ایسا کرے یا کرائے گا تو میں اسے "زنا کی حد" لگاؤں گا۔ (ابن کثیر)

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں نافذ بھی ہوں گی یا نہیں؟ صحیح مسلم شریف اور اکثر کتب احادیث میں منقول حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں، حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں اور حضرت عمرؓ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا طریقہ یہ تھا کہ بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا، لیکن حضرت عمرؓ نے بیک وقت ایک سے زائد طلاق کے رجحان کی حوصلہ شکنی کرنے کے لئے فرمایا : لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ جس میں ان کے لئے مہلت تھی۔ تو مناسب رہے گا ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں۔ چنانچہ آپ نے ان پر نافذ کر دیا۔ (صحیح مسلم، جلد اول)

اپنے دورِ خلافت میں حضرت عمرؓ کے اس اقدام کی روشنی میں اہل سنت کے اکثر و بیشتر ائمہ فقہاء بیک وقت دی گئی تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیتے ہیں۔ لیکن حضرت سعید بن مسیب اور بعض دوسرے تابعین کہتے ہیں کہ جو شخص سنت کے خلاف طلاق دے یا بیک وقت تین طلاق دے، اس کی طلاق سرے سے واقع ہی نہیں ہوتی --- یہی رائے امامیہ کی ہے۔ حضرت طاؤس اور عکرمہ کہتے ہیں کہ تین طلاق دی جائیں تو صرف ایک طلاق واقع ہوتی ہے۔ اسی رائے کو امام ابن تیمیہؒ نے اختیار کیا ہے -- آج کل کے دور میں اہل حدیث حضرات کا بھی یہی مسلک ہے۔

اس کے جواب میں دیگر حضرات یہ روایت پیش کرتے ہیں کہ حضرت رکانہؓ نے اپنی بیوی کو "طلاق بتہ" دے دی۔ یعنی بیک لفظ "البتۃ" استعمال کرتے ہوئے تین طلاقیں دے دیں۔ حضور ﷺ نے استفسار کیا تو حضرت رکانہ نے کہا میری نیت تین کی نہیں ایک کی تھی۔ حضورؐ نے قسم لی۔ حضرت رکانہ نے حلف دیا۔ آپؐ نے ایک ہی طلاق قرار

دے دی۔ (مشکوٰۃ 'باب خلع اور طلاق 'فصل دوم' ترمذی 'ابوداؤد' ابن ماجہ 'دارمی) گویا یہ طلاق دینے والے کی نیت پر منحصر ہے کہ اس نے تین طلاقیں ہی دی تھیں یا اس کی نیت ایک طلاق کی تھی۔ بہرحال حنفی حضرات تین طلاق کے ہی قائل ہیں۔ اس لئے انہیں تو تین طلاق کا لفظ منہ سے نکالتے ہوئے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے 'کیونکہ ان کے لئے اس کے بعد بیوی کو پاس رکھنے کی کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔ رہا "حلالہ" کا طریقہ 'تو یہ حرام اور لعنتی عمل ہے جس کی حقیقت قرآن و حدیث کے ساتھ ہنسی اور مذاق ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گھروں میں امن و عافیت کی فضا قائم رکھے اور ہمیں قرآن و حدیث کے مطابق عمل کرنے کی توفیق دے 'تاکہ ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی سے بچیں اور عنداللہ مسئول ہونے کی بجائے ماجور رہوں۔ آمین!

حواشی

{۱} اسلام نے چوری چھپے شادیوں کی مذمت اور ممانعت فرمائی ہے۔ آپ خود ہی سوچئے کہ ایک شخص کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوتی ہے جسے وہ پیار و محبت سے پال پوس کر جوان کرتا ہے۔ اس کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لئے تن 'من 'دھن' نچھاور کرتا ہے۔ اگر وہ جوان ہو کر ایک نوجوان کے ہمراہ راہ فرار اختیار کرے اور عدالت میں ایک بیان دے کر چپکے سے شادی کر لے 'جسے ہمارے یہاں کورٹ میرج یا سول میرج (Civil Marriage) کہتے ہیں تو باپ کے پلے کیا رہ جاتا ہے؟ چنانچہ امت کی عزت و غیرت کے رکھوالے نبیؐ نے نکاح کا قاعدہ 'کلیہ بیان فرما دیا کہ

لَانِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ (احمد 'ترمذی 'ابوداود 'ابن ماجہ 'دارمی)

"ولی (سرپرست) کے بغیر نکاح نہیں ہے"۔

پھر فرمایا:

اَيُّمَا امْرَءَةٍ نَكَحَتْ نَفْسَهَا بِغَيْرِ اِذْنِ وَلِيِّهَا فَنِكَاحُهَا بَاطِلٌ

(احمد 'ترمذی 'ابوداود 'ابن ماجہ 'دارمی)

"جس لڑکی نے اپنے سرپرست (باپ 'بھائی وغیرہ) کی اجازت کے بغیر اپنا نکاح کیا اس کا نکاح باطل (غلط) ہے"۔

حتیٰ کہ یہاں تک وعید فرمائی۔

لَا تُزَوِّجِ الْمَرْءَةُ نَفْسَهَا فَاِنَّ الزَّانِيَةَ هِيَ الَّتِي تُزَوِّجُ نَفْسَهَا

(ابن ماجہ)

"کوئی لڑکی اپنا نکاح خود نہ کرے' پس جو خود اپنا نکاح کرے گی وہ زنا کرنے والی ہے"۔

نیز:

البغایا التی ینکحن انفسھن بغیر بینۃ

"جو عورتیں گواہوں کے بغیر نکاح کر لیتی ہیں وہ زنا کرنے والی ہیں"۔

ایک رائے یہ ہے کہ عاقل و بالغ لڑکی اپنا نکاح خود کر سکتی ہے۔ یہ رائے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا واضح حدیث کے باوجود قرآن مجید کی اس آیت سے اخذ کی گئی ہے:

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ (البقرہ: ۲۳۱)

"جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو پھر اس میں مانع نہ ہو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں"۔

حالانکہ اس آیت مبارکہ میں "طلاق شدہ" عورت کا ذکر ہے کنواری لڑکی کا نہیں اور مطلقہ عورت یقیناً ازدواجی زندگی کے تجربے سے گزرنے کے بعد پختہ رائے (matured) ہو چکی ہوتی ہے۔ اور اسی کی مثل بیوہ عورت ہے جس کے بارے میں نبیؐ فطرت شناس ﷺ نے فرمایا: "بیوہ عورت اپنے نکاح کے بارے میں اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے"۔ لیکن کنواری لڑکی کے بارے میں فرمایا کہ

البکر یستأذنھا ابوھا فی نفسھا (مسلم)

"کنواری لڑکی سے اس کے نکاح کی اجازت اس کا باپ حاصل کرلے"۔

گویا اسلام نے نکاح کا اصول یہ رکھا ہے کہ نکاح گواہوں کی موجودگی میں' اور ولی کی سرپرستی میں عورت کی اجازت سے کیا جائے اور اس کا اعلان عام کیا جائے۔

{۲} زبردستی اور زورِ بازو سے لی ہوئی طلاق جسے (طلاقِ مکرہ) کہتے ہیں' واقع نہیں ہوتی۔ کیونکہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: لاطلاق فی اغلاق (ابوداؤد' ابن ماجہ) یعنی "زبردستی کی طلاق نہیں ہے"۔ (ابوداؤد' ابن ماجہ)

{۳} "سازشی نکاح" (جس کو "حلالہ" کہا جاتا ہے) جس میں پہلے سے طے ہو کہ عورت کو سابق شوہر کے لئے حلال کرنے کی خاطر ایک آدمی اس سے نکاح کرے گا اور مباشرت کرنے کے بعد اسے طلاق دے دے گا' تو امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ نکاح فاسد ہے۔ (تفہیم القرآن)

{۴} نئے نکاح کے لئے "عدت" کا پورا ہونا بھی شرط ہے مگر "حلالہ" کی شکل میں نیا نکاح' جو خود فریبی' جھوٹ اور ڈرامہ ہے' اس میں حلالہ کرنے اور کرانے والے چند دنوں کے اندر ہی سارا عمل مکمل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اس نکاح کو اگر صحیح بھی "فرض" کر لیا جائے تو عورت کو پہلے شوہر سے تین طلاق ملنے کے بعد تین طہر (مہینوں) تک انتظار کرنا چاہئے تھا اور دوسرے فرضی شوہر سے جس کو کرائے کا سانڈ کہا گیا ہے' دوبارہ طلاق ملنے کے بعد پھر

(باقی صفحہ ۵۰ پر)

قتلِ مرتد ـــــ عقلی جواز (۲)

مخالفین کے اعتراضات کے جواب میں سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی نگارشات

ـــــ مرتب : محمد اسماعیل قریشی ـــــ

جوابی کارروائی کا خطرہ

پچھلے صفحات میں ہم نے دنیا کے دوسرے نظاموں سے سزائے ارتداد کی جو مثالیں پیش کی ہیں' وہ ایک اور الجھن کو بھی رفع کر دیتی ہیں' جو اس مسئلہ میں اکثر سطحی النظر لوگوں کے دماغ کو پریشان کیا کرتی ہے۔ یہ لوگ سوچتے ہیں کہ اگر دوسرے ادیان بھی اسی طرح اپنے دائرے سے باہر جانے والوں کے لیے سزائے موت کا قانون مقرر کر دیں' جس طرح اسلام نے کیا ہے' تو یہ چیز اسلام کی تبلیغ کے راستے میں بھی ویسی ہی رکاوٹ بن جائے گی' جیسی دوسرے ادیان کی راہ میں بنتی ہے۔ اس کا اصولی جواب اس سے پہلے ہم دے چکے ہیں' مگر یہاں ہمیں اس کا عملی جواب بھی مل جاتا ہے۔ معترضین ناواقفیت کی بنا پر اپنا اعتراض لفظ "اگر" کے ساتھ پیش کرتے ہیں' گویا کہ واقعہ یہ نہیں ہے' حالانکہ دراصل وہ چیز' جس کا یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں' واقعہ کی صورت میں موجود ہے۔ دنیا میں جو دین بھی اپنی ریاست رکھتا ہے' وہ اپنے حدود اقتدار میں ارتداد کا دروازہ بزور بند کیے ہوئے ہے۔ غلط فہمی صرف اس وجہ سے واقع ہوتی ہے کہ آج کل عیسائی قومیں اپنی مملکتوں میں عیسائیت سے مرتد ہو جانے والوں کو کسی قسم کی سزا نہیں دیتیں اور ہر شخص کو آزادی عطا کر دیتی ہیں کہ جس مذہب کو چاہے اختیار کر لے۔ اس سے لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان کے قانون میں ارتداد جرم نہیں ہے اور یہ ایک رحمت ہے' جس کی وجہ سے مذہبی تبلیغ تمام رکاوٹوں سے آزاد ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ عیسائیت ان قوموں کے افراد کا

محض ایک مخصی مذہب ہے' ان کا "اجتماعی دین" نہیں ہے' جس پر ان کی سوسائٹی کا نظام اور ان کے سٹیٹ کی عمارت قائم ہو۔ اس لیے عیسائیت سے پھر جانے کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتیں کہ اس پر رکاوٹ عاید کرنے کی ضرورت محسوس کریں۔ رہا ان کا "اجتماعی دین" جس پر ان کی سوسائٹی اور ریاست کی بنیاد قائم ہوتی ہے' تو اس سے مرتد ہونے کو وہ بھی اسی طرح جرم قرار دیتی ہیں' جس طرح اسلام اسے جرم قرار دیتا ہے اور اس کو دبانے کے معاملے میں وہ بھی اتنی ہی سخت ہیں جتنی اسلامی ریاست سخت ہے۔ انگریزوں کا اجتماعی دین عیسائیت نہیں ہے بلکہ برطانوی قوم کا اقتدار اور برطانوی دستور و آئین کی فرمانروائی ہے' جس کی نمائندگی تاج برطانیہ کرتا ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کا اجتماعی دین بھی عیسائیت نہیں بلکہ امریکی قومیت اور وفاقی دستور کا اقتدار ہے' جس پر ان کی سوسائٹی ایک ریاست کی شکل میں منظم ہوئی ہے۔ اسی طرح دوسری عیسائی قوموں کے اجتماعی دین بھی عیسائیت کے بجائے ان کے اپنے قومیت سٹیٹ اور دستور ہیں۔ ان ادیان سے ان کا کوئی پیدائشی یا اختیاری پیرو ذرا مرتد ہو کر دیکھ لے' اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ ان کے ہاں ارتداد جرم ہے یا نہیں۔

اس معاملے کو انگریزی قانون کے ایک مصنف نے خوب واضح کر دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "یہاں ہم تفصیل کے ساتھ ان وجود کی تحقیق نہیں کرنا چاہتے' جن کی بنیاد پر ریاست نے مذہب کے خلاف بعض جرائم پر سزا دینے کا اختیار اپنے ہاتھ میں لیا ہے۔ بس اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ تجربے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ بعض خاص افعال یا طرز عمل' جو مذہب میں ممنوع ہیں' اجتماعی زندگی کے لیے بھی خرابی اور بدنظمی کے موجب ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ افعال غیر قانونی اور ان کے مرتکب مستلزم سزا قرار دیے گئے ہیں' نہ اس وجہ سے کہ وہ خدا کے قانون کو توڑتے ہیں' بلکہ اس وجہ

سے کہ وہ ملکی قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں"۔

آگے چل کر وہ پھر لکھتا ہے:

"ایک زمانہ دراز تک انگریزی قانون میں ارتداد یعنی عیسائیت سے بالکل پھر جانے کی سزا موت تھی۔ بعد میں یہ قانون بنایا گیا کہ اگر کوئی شخص، جس نے عیسائیت کی تعلیم حاصل کی ہو یا عیسائی مذہب کی پیروی کا اقرار کیا ہو، تحریر یا طباعت یا تعلیم یا سوچی سمجھی ہوئی تقریر کے سلسلے میں اس خیال کا اظہار کرے کہ خدا ایک کے بجائے متعدد ہیں، یا عیسائی مذہب کے حق ہونے سے یا کتاب مقدس کے منجانب اللہ ہونے سے انکار کرے، تو پہلی خطا پر وہ ملکی اور فوجی ملازمت میں داخل ہونے سے محروم کیا جائے گا اور دوسری خطا پر اسے تین سال کے لیے قید کی سزا دی جائے گی۔ لیکن یقین کیا جاتا ہے کہ اس قانون کے تحت کبھی کسی شخص پر مقدمہ نہیں چلایا گیا"۔

چند سطور کے بعد پھر لکھتا ہے:

"کہا گیا ہے کہ عیسائیت انگریزی قانون کا ایک جزو ہے اور اس کے خلاف کسی فاش حملہ کے ارتکاب پر ریاست کی طرف سے سزا دی جاتی ہے۔ اس جرم کی حدود میں تحریر یا تقریر کے ذریعہ سے خدا کی ہستی یا اس کی تقدیر کا انکار ہمارے خداوند اور منجی مسیح کی اہانت اور کتب مقدسہ یا ان کے کسی جزو کا استہزاء شامل ہے۔ اس پر صرف اتنا اضافہ کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ اس قانون کو شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کیا گیا ہے"

اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ عیسائیت (یعنی جسے وہ خدا کا "قانون" کہتے ہیں) چونکہ اب ملکی قانون نہیں ہے، اس لیے ریاست اول تو اس کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو سزا دینے کی ذمہ داری اپنے سر لیتی ہی نہیں یا اگر اس بنا پر کہ ابھی

تک یہ عیسائیت حکمراں افراد کا مذہب ہے' وہ برائے نام اس ذمہ داری کو قبول کرتی بھی ہے' تو عملاً اس کو ادا کرنے سے پہلوتہی کرتی ہے۔ لیکن خود ملکی قانون جو دراصل ان کا اجتماعی دین ہے' کیا اس کے معاملے میں بھی ان کا طرز عمل یہی ہے؟ اس کا جواب آپ عملاً پا سکتے ہیں اگر ذرا ہمت کر کے برطانوی رعایا کا کوئی فرد برطانوی حدود میں رہتے ہوئے تاج برطانیہ کے اقتدار اعلیٰ اور سلطنت کے آئین کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔

پس درحقیقت وہ حالت تو عملاً قائم ہے' جس کے متعلق غلط فہمی کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ "اگر" ایسا ہوا تو کیا ہوگا' لیکن اس حالت کے قائم ہونے سے موجودہ زمانے کی مذہبی تبلیغ میں کوئی رکاوٹ اس لیے واقع نہیں ہوتی کہ آج کل دنیا میں جن مختلف مذاہب کی تبلیغ کی جا رہی ہے' ان میں سے کسی مذہب کو چھوڑ کر کسی دوسرے مذہب میں چلے جانے سے دنیوی مملکتوں کے "اجتماعی دین" میں کوئی رخنہ نہیں پڑتا۔ تمام مذاہب بالفعل اس اجتماعی دین کے تابع بن کر رہتے ہیں اور ان حدود کی پابندی کرتے ہیں' جن میں اس نے انہیں محدود کر دیا ہے' لہٰذا اس کے تابع فرمان اور مطیع امر رہتے ہوئے اگر آپ نے ایک مذہبی عقیدہ و عمل کو چھوڑ کر دوسرا مذہبی عقیدہ و عمل اختیار کر لیا تو اجتماعی دین کے نقطہ نظر سے فی الواقع آپ کے اندر کوئی فرق رونما نہیں ہوا' نہ آپ نے کسی ارتداد کا ارتکاب کیا کہ وہ آپ سے بازپرس کرے۔ ہاں اگر آپ اس اجتماعی دین کے اعتقاداً و عملاً کافر بن جائیں اور کسی دوسرے اجتماعی دین کے اعتقادی مومن بن کر عملی مسلم بننے کی کوشش کریں' تو آج کا ہر حکمران آپ کے ساتھ وہی کچھ کرنے کے لیے تیار ہے' جو آج سے ساڑھے تین ہزار برس پہلے کا حکمران حضرت موسیٰ کے ساتھ کرنے کے لیے تیار ہوا تھا کہ

ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (المومن ۲۶)

پیدائشی مسلمانوں کا مسئلہ

اس سلسلے میں ایک آخری سوال اور باقی رہ جاتا ہے جو "قتل مرتد" کے حکم پر

بہت سے دماغوں میں تشویش پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص پہلے غیر مسلم تھا' پھر اس نے باختیار خود اسلام قبول کیا اور اس کے بعد دوبارہ کفر اختیار کر لیا' اس کے متعلق تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس نے جان بوجھ کر غلطی کی' کیوں نہ وہ ذمی بن کر رہا اور کیوں ایسے اجتماعی دین میں داخل ہوا' جس سے نکلنے کا دروازہ اسے معلوم تھا کہ بند ہے۔ لیکن اس شخص کا معاملہ ذرا مختلف ہے جس نے اسلام کو خود نہ قبول کیا ہو بلکہ مسلمان ماں باپ کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے اسلام آپ سے آپ اس کا دین بن گیا ہو۔ ایسا شخص اگر ہوش سنبھالنے کے بعد اسلام سے مطمئن نہ ہو اور اس سے نکل جانا چاہے تو یہ بڑا غضب ہے کہ آپ اسے بھی سزائے موت کی دھمکی دے کر اسلام کے اندر رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک زیادتی معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ پیدائشی منافقوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اسلام کے اجتماعی نظام کے اندر پرورش پاتی رہے۔

اس شبہ کا ایک جواب اصولی ہے اور ایک عملی۔ اصولی جواب یہ ہے کہ پیدائشی اور اختیاری پیروؤں کے درمیان احکام میں فرق نہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی دین نے کبھی ان کے درمیان فرق کیا ہے۔ ہر دین اپنے پیروؤں کی اولاد کو فطرۃً اپنا پیرو قرار دیتا ہے اور ان پر وہ سب احکام جاری کرتا ہے' جو اختیاری پیروؤں پر جاری کیے جاتے ہیں۔ یہ بات عملاً ناممکن اور عقلاً بالکل لغو ہے کہ پیروان دین' یا سیاسی اصطلاح میں رعایا اور شہریوں کی اولاد کو ابتداءً کفار یا اغیار (Aliens) کی حیثیت سے پرورش کیا جائے اور جب وہ بالغ ہو جائیں تو اس بات کا فیصلہ ان کے اختیار پر چھوڑ دیا جائے کہ آیا وہ اس دین کی پیروی یا اس سٹیٹ کی وفاداری قبول کرتے ہیں یا نہیں جس میں وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اس طرح تو کوئی اجتماعی نظام دنیا میں کبھی چل ہی نہیں سکتا۔ اجتماعی نظام کے بقاء و استحکام کا زیادہ تر انحصار اس مستقل آبادی پر ہوتا ہے' جو اس کی پیروی پر ثابت و قائم اور اس کے تسلسل حیات کی ضامن ہو اور ایسی مستقل آبادی صرف اسی طرح بنتی ہے کہ نسل کے بعد نسل آکر اس نظام کو جاری رکھنے کی ذمہ داری لیتی چلی جائے۔ اگر پیروؤں اور شہریوں کی ہر نسل کے بعد دوسری

نسل کا اس پیروی و شہریت پر قائم رہنا اور اس نظام کو برقرار رکھنا مشتبہ اور غیر یقینی ہو' تو اجتماعی نظام کی بنیاد دائماً متزلزل رہے گی اور کبھی اس کو استحکام نصیب ہی نہ ہوگا۔ لہٰذا پیدائشی پیروی و شہریت کو اختیاری میں تبدیل کر دینا اور ہر بعد کی نسل کے لیے دین اور دستور و آئین اور تمام وفاداریوں سے انحراف کا دروازہ کھلا رکھنا' ایک ایسی تجویز ہے جو بجائے خود سخت نامعقول ہے اور دنیا میں آج تک کسی دین' کسی اجتماعی نظام اور کسی ریاست نے اس کو اختیار نہیں کیا ہے۔

اس کا عملی جواب یہ ہے کہ جو اندیشہ ہمارے معترضین بیان کرتے ہیں' وہ درحقیقت عملی دنیا میں کبھی رونما نہیں ہوتا۔ ہر اجتماعی نظام' جس میں کچھ بھی زندگی کی طاقت اور خواہش موجود ہو' پوری توجہ کے ساتھ اس کا انتظام کیا کرتا ہے کہ اپنے دائرے میں پیدا ہونے والی نئی نسلوں کی طرف اپنی روایات' اپنی تہذیب' اپنے اصولوں اور اپنی وفاداریوں کو منتقل کرے اور انہیں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ قابل اعتماد بنائے۔ اس تعلیم و تربیت کی وجہ سے نئی نسلوں کی بہت بڑی اکثریت' 999 فی ہزار سے بھی زیادہ اکثریت' اس نظام کے اتباع پر راضی اور اس کی وفادار بن کر اٹھتی ہے' جس میں وہ پیدا ہوتی ہے۔ ان حالات میں صرف چند ہی افراد ایسے پیدا ہوسکتے ہیں جو مختلف وجوہ سے انحراف و بغاوت کا میلان لیے ہوئے اٹھیں یا بعد میں اس کا اکتساب کر لیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے چند افراد کی خاطر اصول میں کوئی ایسا تغیر نہیں کیا جا سکتا' جس سے پوری سوسائٹی کی زندگی خطرے اور بے اطمینانی میں مبتلا ہو جائے۔ ایسے چند افراد اگر اجتماعی دین سے انحراف کرنا چاہیں تو ان کے لیے دو دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ یا تو ریاست کے حدود سے باہر جا کر اس سے انحراف کریں' یا اگر وہ اپنے اس انحراف میں راسخ ہیں اور جس دوسرے نظام کو انہوں نے پسند کیا ہے' اس کی پیروی میں صادق الایمان ہیں اور اپنے آبائی دین کی جگہ اسے قائم کرنے کا سچا عزم رکھتے ہیں' تو اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالیں اور جان جوکھوں کا وہ کھیل کھیلیں جس کے بغیر کسی نظام کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

پس جہاں تک نفس مسئلہ کا تعلق ہے' وہ بہرحال یہی رہے گا کہ مسلمانوں کی

نسل سے پیدا ہونے والی اولاد مسلمان ہی سمجھی جائے گی اور قانون اسلام کی طرف سے ان کے لیے ارتداد کا دروازہ ہرگز نہ کھولا جائے گا' اگر ان میں سے کوئی اسلام سے پھرے گا' تو وہ بھی اسی طرح قتل کا مستحق ہوگا' جس طرح وہ شخص جس نے کفر سے اسلام کی طرف آکر پھر کفر کا راستہ اختیار کیا ہو۔ یہ تمام فقہائے اسلام کا متفق علیہ فیصلہ ہے اور اس باب میں ماہرین شریعت کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اسلامی رویہ کی معقولیت

سائل کا آخری سوال یہ ہے کہ اگر اسلامی حکومت کے دائرے میں تبلیغ کفر کی اجازت نہیں ہے' تو عقلی حیثیت سے اس ممانعت کو کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس باب میں کوئی بحث کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ جس تبلیغ کفر کی اسلام ممانعت کرتا ہے' اس کی نوعیت واضح طور پر سمجھ لی جائے۔ اسلام اس چیز میں مانع نہیں ہے کہ دارالاسلام کے حدود میں کوئی غیر مسلم اپنی اولاد کو اپنے مذہب کی تعلیم دے' یا اپنے مذہب کے عقائد اور اصول لوگوں کے سامنے تحریر یا تقریر کے ذریعے سے بیان کرے' یا اسلام پر اگر وہ کچھ اعتراضات رکھتا ہو تو انہیں تہذیب کے ساتھ تقریر و تحریر میں پیش کرے۔ نیز اسلام اس میں بھی مانع نہیں ہے کہ کسی غیر مسلم کے خیالات سے متاثر ہو کر دارالاسلام کی ذمی رعایا میں سے کوئی شخص اس کا مذہب قبول کر لے۔ ممانعت دراصل جس چیز کی ہے' وہ یہ ہے کہ کسی مذہب یا نظام فکر و عمل کی تائید میں کوئی ایسی منظم تحریک اٹھائی جائے' جو دارالاسلام کی حدود میں رہنے والوں کو اس مذہب یا نظام کی طرف دعوت دیتی ہو۔ ایسی منظم دعوت' قطع نظر اس سے کہ وہ ذمیوں میں سے اٹھے یا باہر سے آنے والے غیر مسلموں کی طرف سے بہرحال اسلام اپنے حدود میں اس کے ظہور کو برداشت کرنے لیے تیار نہیں ہے۔

اس کی صاف اور سیدھی وجہ یہ ہے کہ ایک منظم دعوت لامحالہ یا تو سیاسی

نوعیت کی ہوگی یا مذہبی و اخلاقی نوعیت کی۔ اگر وہ سیاسی نوعیت کی ہو اور اس کے پیش نظر نظام زندگی کا تغیر ہو' تو جس طرح دنیا کی ہر ریاست ایسی دعوت کی مزاحمت کرتی ہے' اسی طرح اسلامی ریاست بھی کرتی ہے اور اگر وہ دوسری نوعیت کی دعوت ہو تو خالص دنیوی ریاستوں کے برعکس اسلام اسے اس لیے گوارا نہیں کر سکتا کہ کسی اعتقادی و اخلاقی گمراہی کو اپنی نگرانی و حفاظت میں سر اٹھانے کا موقع دینا قطعی طور پر اس مقصد کی ضد ہے' جس کے لیے اسلام ملک کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس معاملہ میں خالص دنیوی حکومتوں کا طرز عمل اسلامی حکومت کے طرز عمل سے یقیناً مختلف ہے' کیونکہ دونوں کے مقاصد حکومت مختلف ہیں۔ دنیوی حکومتیں ہر جھوٹ' ہر اعتقادی فساد اور ہر قسم کی بد عملی و بداخلاقی کو اور اسی طرح ہر مذہبی گمراہی کو بھی' اپنی حدود میں پھیلنے کی اجازت دیتی ہیں اور خوب ڈھیلی رسی چھوڑے رکھتی ہیں' جب تک کہ ان مختلف چیزوں کے پھیلانے والے ان کے وفادار رہیں' ان کو ٹیکس ادا کرتے رہیں اور ایسی کوئی حرکت نہ کریں جس سے ان کے سیاسی اقتدار پر آنچ آتی ہو۔ البتہ جن تحریکوں سے اپنے سیاسی اقتدار پر آنچ آنے کا انہیں ذرا سا بھی خطرہ ہو جاتا ہے' ان کو خلاف قانون قرار دینے اور قوت سے کچل دینے میں وہ ذرہ برابر تامل نہیں کرتیں۔ ان کے اس طرز عمل کی وجہ یہ ہے کہ انہیں بندگان خدا کی اخلاقی و روحانی فلاح سے کوئی دلچسپی نہیں ہے' ان کے لیے تو اپنا سیاسی اقتدار اور اپنی مادی اغراض ہی سب کچھ ہیں۔ مگر اسلام کو اصل دلچسپی خدا کے بندوں کی روحانی و اخلاقی فلاح ہی سے ہے اور اسی کی خاطر وہ انتظام ملکی اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ اس لیے وہ سیاسی فساد یا انقلاب برپا کرنے والی تحریکوں کی طرح ان تحریکوں کو بھی برداشت نہیں کر سکتا' جو اخلاقی فساد یا اعتقادی گمراہی پھیلانے والی ہوں۔

یہاں پھر وہی سوال ہمارے سامنے آتا ہے جو قتل مرتد کے مسئلہ میں آیا کرتا ہے' یعنی یہ کہ اگر غیر مسلم حکومتیں بھی اسی طرح اپنے حدود میں اسلام کی دعوت کو خلاف قانون قرار دے دیں تو کیا ہو؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ اسلام اس قیمت پر حق و صداقت کی اشاعت کی آزادی خریدنا نہیں چاہتا کہ اس کے جواب میں اسے

جھوٹ اور باطل کی اشاعت کی آزادی دینی پڑے۔ وہ اپنے پیروؤں سے کہتا ہے کہ

"اگر تم سچے دل سے مجھے حق سمجھتے ہو اور میری پیروی ہی میں اپنی اور انسانیت کی نجات دیکھتے ہو تو میری پیروی کرو' مجھے قائم کرو اور دنیا کو میری طرف دعوت دو' خواہ اس کام میں تم کو گلزار ابراہیمؑ سے سابقہ پیش آئے یا آتش نمرود سے گزرنا پڑے۔ یہ تمہارے اپنے ایمان کا تقاضا ہے اور یہ بات تمہاری خدا پرستی پر منحصر ہے کہ اس کی رضا چاہتے ہو تو اس تقاضے کو پورا کرو ورنہ نہ کرو۔ لیکن میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ تمہیں اس راہ کی خطرناکیوں سے بچانے اور اس کام کو تمہارے حق میں سہل بنانے کی خاطر باطل پرستوں کو یہ جوابی "حق" عطا کروں کہ وہ خدا کے بندوں کو گمراہ کریں اور اپنے راستوں پر انہیں ہانک لے جائیں جن میں مجھے معلوم ہے کہ ان کے لیے تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں"۔

یہ اسلام کا ناقابل تغیر فیصلہ ہے اور اس میں وہ کسی سے مصالحت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اگر غیر مسلم حکومتیں آج یا آئندہ کسی وقت اسلام کی تبلیغ کو اسی طرح جرم قرار دیں' جس طرح وہ پہلے اسے جرم قرار دیتی رہی ہیں' تب بھی اس فیصلہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اسلام کے لیے وہ گھڑی بہت منحوس تھی' جب کفار کی نگاہ میں وہ اتنا بے ضرر بن گیا کہ اس کی دعوت و تبلیغ کو وہ بخوشی گوارا کرنے لگے اور قانون کفر کی حفاظت و نگرانی میں اسے پھیلنے کی پوری سہولتیں بہم پہنچنے لگیں۔ اسلام کے ساتھ کفر کی یہ رعایتیں حقیقت میں خوش آئند نہیں ہیں۔ یہ تو اس بات کی علامت ہیں کہ اسلام کے قالب میں اس کی روح موجود نہیں رہی ہے' ورنہ آج کے کافر کچھ نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب سے بڑھ کر نیک دل نہیں ہیں کہ اس مسلم نما قالب میں اسلام کا اصلی جوہر موجود ہو اور پھر بھی وہ اسے اپنی سرپرستی و حمایت سے سرفراز کریں یا کم از کم اسے پھیلنے کی آزادی ہی

عطا کر دیں۔ جب سے ان کی عنایات کی بدولت اسلام کی دعوت محض گلزار ابراہیمؑ کی گلگشت بن کر رہ گئی' اسی وقت سے اسلام کو یہ ذلت نصیب ہوئی کہ وہ ان مذاہب کی صف میں شامل کر دیا گیا جو ہر ظالم نظام تمدّن و سیاست کے ماتحت آرام کی جگہ پا سکتے ہیں۔ بڑی مبارک ہوگی وہ ساعت جب یہ رعایتیں واپس لے لی جائیں گی اور دین حق کی طرف دعوت دینے والوں کی راہ میں پھر آتش نمرود حائل ہو جائے گی۔ اسی وقت اسلام کو وہ سچے پیرو اور داعی ملیں گے' جو طاغوت کا سر نیچا کر کے حق کو اس پر غالب کرنے کے قابل ہوں گے۔"

متذکرہ بالا دلائل و براہین اور حقائق کے بعد کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ توہین رسالت کا جرم ارتداد سے بھی سنگین تر اور ناقابل معافی جرم ہے اور توبہ سے تنقیص رسالت کی حد' جو سزائے موت ہے' وہ ساقط نہیں ہوتی' کیونکہ یہی معاملہ دوسرے حدود کا بھی ہے کہ سارق یا قاذف بہتان تراشی کرنے والے کی سزا حد توبہ سے ساقط نہیں ہوتی۔

☆☆☆

بقیہ : نکاح طلاق اور حلالہ

پہلے شوہر سے نکاح کرنے کے لئے مزید تین ماہ تک بطور "عدت" انتظار کرنا چاہئے تھا۔

یہاں ایک اور مشاہدے کا ذکر بھی بے جا نہ ہوگا۔ بیک وقت تین طلاق دینے والے بعض اوقات "حلالہ" کا ڈرامہ رچانے کی بجائے کسی جاہل مذہبی پیشوا سے یہ فتویٰ حاصل کر لیتے ہیں کہ ساٹھ آدمیوں کو کھانا کھلا دو تو بیوی کو بدستور پاس رکھنا جائز ہو جائے گا۔ حالانکہ یہ شریعت اسلام کا ایک اور قانون ہے جسے "ظہار" کہا جاتا ہے اور اسے طلاق سے خلط ملط کرنا درست نہیں کیونکہ اس کا طلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت سے آج تک بعض مرد غصہ کی حالت میں بیوی کو ماں' بہن یا بیٹی کہہ دیتے ہیں۔ اس سے ان پر ان کی بیوی ہمیشہ کے لئے حرام نہیں ہو جاتی بلکہ اس جاہلانہ حرکت کی سزا کے طور پر بطور کفارہ "ایک غلام آزاد کرنا" یا "دو ماہ تک مسلسل روزے رکھنا" یا "ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کا کھانا کھلانا" لازم ہو جاتا ہے۔ یہ کفارہ ادا کئے بغیر بیوی حلال نہیں ہو سکتی۔ البتہ ایسا کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔

☆☆☆

سرحد سے ایک خط، اور امیر تنظیم کا جواب

جس میں دینی جماعتوں کو یکجا دیکھنے کے خواہشمند حضرات کے لئے رہنمائی کا بہت کچھ سامان موجود ہے

ذیل کا خط اس اعتبار سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے کہ مکتوب نگار اسلامی جمعیت طلبہ' صوبہ سرحد کے اہم عہدیدار رہے ہیں اور اگرچہ جماعت اسلامی میں باضابطہ شامل تو نہیں ہوئے تاہم اس کے فعال ہمدردوں میں سے ضرور ہیں۔ خط کے بین السطور اس مقصد اور مشن کے ساتھ ان کی بے پناہ دلی وابستگی جھلکتی دکھائی دیتی ہے جس کیلئے تمام احیائی تحریکیں سرگرم عمل ہیں۔ یہی جذبہ اس کا محرک بنا کہ قبل ازیں وہ امیر تنظیم اسلامی سے ملاقات کیلئے قرآن اکیڈمی تشریف لائے تھے۔ شاید یہی سبب ہے کہ امیر تنظیم اسلامی نے اس خط کو اتنی اہمیت دی کہ اس کا مفصل جواب بھی خود تحریر فرمایا۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

انتہائی قابل عزت و احترام ڈاکٹر صاحب السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ اس مہینے کی نو تاریخ کو میں اور برادرم ڈاکٹر فضل عظیم آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ ہمیں قطعاً یقین نہیں تھا کہ آپ اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر ہمیں ملاقات کا موقع دیں گے۔ لیکن ہماری خوشگوار حیرت کی انتہا نہ رہی جب آپ نے نہ صرف ملاقات کی آرزو پوری فرمائی بلکہ خاصا وقت دے کر نہایت مفید گفتگو میں ہم تک قیمتی معلومات پہنچائیں۔ ہم اس احسان پر آپ کے تہہ دل سے ممنون و مشکور ہیں۔ دوران ملاقات جو کتابیں ہمیں عنایت کی گئیں ان میں سے "مولانا مودودی اور میں" تو میں پڑھ چکا' دوسری کتابوں کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔ یہاں

سوات پہنچنے کے تین دن بعد مجھے انجمن خدام القرآن کی جانب سے کچھ کتابیں اور مل گئیں۔ امید ہے ان کا مطالعہ کرنے کے بعد ان شاءاللہ میرا تنظیم کے لٹریچر کا مطالعہ مکمل ہو جائے گا۔ تنظیم کے دعوتی لٹریچر کا مطالعہ اگرچہ میں پہلے بھی کر چکا ہوں لیکن ارادہ ہے کہ ان شاءاللہ از سرنو اسے پڑھوں گا۔

آپ سے ملاقات کے نتیجے میں اس خوشگوار تاثر نے ہمیں مزید اطمینان دلایا ہے کہ آپ دینی جماعتوں کے اتحاد کے بارے میں خاصے سنجیدہ ہیں۔ ہمیں یقین ہوا ہے کہ دینی قوتوں کو متحد کرنے کے معاملے میں آپ کا رویہ مثبت اور آپ کا جذبہ تعمیری ہے۔ جماعت اور تنظیم کے ہزاروں کارکنوں اور ملتِ اسلامیہ کے ہزاروں بہی خواہوں کی یہ دلی آرزو ہے کہ نہ صرف مملکت خداداد پاکستان میں بلکہ عالمی سطح پر تمام دینی قوتیں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے قرآنی فریضے کو تقاضائے قرآن کے مطابق انجام دیں۔ جماعت اسلامی کی تاریخ' اس میں عزیمتوں کی داستان اور تنظیم اسلامی کے قیام کے اسباب کا اب تک جو مطالعہ میں نے کیا ہے' میں پوری ایمانداری سے اس حقیقت کے اظہار پر مجبور ہوں کہ آپ اور دوسرے اکابرین جماعت جو ماچھی گوٹھ کے اجتماع کے بعد الگ ہونے پر مجبور ہوئے' اگر کسی طرح جماعت سے وابستہ رہتے اور اندر ہی اندر' اصلاح کی کوششیں فرماتے تو ایک نہ ایک دن آپ جماعت کو اپنے انقلابی راستے پر دوبارہ واپس لانے میں کامیاب ہو جاتے۔ ثبوت کے طور پر میں صرف دو مثالیں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔

(۱) ایک یہ کہ "مولانا مودودی مرحوم اور میں" میں آپ صفحہ ۶۰ پر لکھتے ہیں :

"..... مولانا مودودی اس حتمی نتیجے تک بھی پہنچ گئے تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے الیکشن کا طریقہ بالکل ناکام ہو چکا ہے اور ہمیں اپنے سابقہ طریق کار ہی کی طرف رجوع کر لینا چاہئے....."

ممکن ہے آپ کو اس سے اتفاق نہ ہو لیکن جماعت اور تنظیم کے بہت سارے احباب کی رائے یہ ہے کہ اگر اس وقت آپ اور دوسرے اکابرین جماعت' جماعت کے ساتھ ہوتے' اور خصوصاً آپ اپنی توانا آواز کو مولانا مودودیؒ کی تائید میں بلند فرماتے تو کوئی وجہ

نہیں کہ آج ہم جماعت اسلامی کو ایک بار پھر اپنے اصلی انقلابی روپ میں نہ دیکھتے۔

(۲) جماعت کے اندر رہتے ہوئے اصلاح کی کوششوں کی دوسری مثال جماعت اسلامی کا موجودہ بحران ہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ محترم قاضی حسین احمد کی قیادت میں جماعت اپنا رہا سہا دینی کردار کھو رہی تھی اور اس کی کوکھ سے پاسبان اور اسلامی فرنٹ جیسے وقتی سیاسی جتھے برآمد ہو رہے تھے۔ لیکن محترم میاں طفیل محمد' مولانا گوہر رحمٰن صاحب اور کچھ دوسرے بزرگوں کی بھرپور مخالفت اور مزاحمت کارگر ثابت ہوئی اور اب پاسبان اور اسلامی فرنٹ دونوں عملاً ختم ہو چکے ہیں۔ محترم نعیم صدیقی صاحب تحریک اسلامی کے نام سے ایک الگ قافلے میں عازم سفر ہوئے ہیں۔ لیکن اس حقیقت کو سب سے زیادہ آپ ہی جانتے ہیں کہ اس پر آشوب دور میں دینی احیاء کی تحریکیں اگر روز اٹھتی ہیں تو نتائج کے اعتبار سے ان کے بار آور ہونے کے امکانات کتنے ہیں۔

محترم ڈاکٹر صاحب! اس گفتگو سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ میں تنظیم اسلامی کے قیام کو خدانخواستہ غلط سمجھ رہا ہوں یا آپ کی مساعی گراں قدر کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ انسانی بساط کی حد تک آپ نے قرآن عظیم کی بے پناہ خدمت کی ہے' جس کا صلہ آپ کے رب کے پاس محفوظ ہے۔ تنظیم اسلامی کی شکل میں آپ نے ایک خالص اسلامی انقلابی جماعت کا ماڈل دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت کے باوجود ایک منفی رد عمل بھی سامنے آیا ہے جس میں کم از کم دو باتیں ایسی ہیں جن سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔

(۱) تنظیم یا جماعت کا ایک کارکن جب اقامتِ دین کی دعوت دیتا ہے اور دو چار آدمیوں کے مجمع میں اٹھ کر اسلام کا نام لیتا ہے تو دین کا درد رکھنے والے لوگوں ۔ خصوصاً تعلیم یافتہ حضرات کا پہلا سوال ان سے یہ ہوتا ہے کہ کونسا اسلام؟ مودودیؒ کا؟ اسرار کا؟ یا تبلیغ کا؟۔ مصروفیت کے اس مشینی دور میں ہر کسی کے پاس اتنا وقت نہیں کہ وہ جماعت و تنظیم کا پورا لٹریچر پڑھ سکے یا تبلیغی نصاب اور اس کے چلوں' سہ روزوں میں عمر کھپا کر اس فرق کو معلوم کر سکے کہ حقیقی اسلامی انقلابی راستے پر دعوت دین دینے والی جماعت کونسی ہے۔ بلکہ بدقسمتی یہ ہے کہ اگر کوئی دل درد مند خدمت دین کے لئے تڑپتا بھی ہو اور وہ اقامت دین کے لئے کام کرنا چاہتا بھی ہو تو اسے سب سے پہلے جماعت اور تنظیم کے

اختلافات کے گہرے پانی والے تالاب میں اترنا پڑتا ہے۔ اگر اسے وہ باہوش و حوصلہ "سلامتی" سے پار بھی کرلے تو آگے میدان میں اس کے لئے عملاً کام کرنے کے مواقع بھی بہت کم رہ جاتے ہیں اور اختلافات کی الجھن تو ساری عمر دامن گیر رہتی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے عزم شکستگی اور مایوسی کے جو مراحل پیش آتے ہیں ان سے بہ سلامت روی نکلنا محال ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے بہت سے ایسے لوگوں کو جماعت اور تنظیم کے لٹریچر کا مطالعہ ادھورا چھوڑ کر "تبلیغ" کی سیدھی اور آسان شاہراہ پر خرامانِ سفر دیکھا ہے۔ تنظیم اور جماعت' جن کا منبع فکر ایک ہے' اگر اشتراک عمل کے کسی فارمولے پر اتفاق کرلیں تو اقامت دین کے ایک داعی کا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ میری دانست میں جماعت اسلامی اگر انتخابی سیاست پر مکمل بھروسہ اور تکیہ چھوڑ دے' جماعت کے اندر دینی رنگ غالب کرنے کے لئے سخت دینی تربیتی نظام (جو خود آپ کی تنظیم اسلامی میں موجود ہے) قائم کرے تو ایک درست انتخابی نظام (جو موجودہ انتخابی نظام نہیں) میں پرامن تبدیلی لانے کے لئے کسی انتخابی معرکے میں تمام اخلاقی و قانونی اصولوں کی پابندی کے ساتھ اس حیثیت میں شرکت --- کہ وہ جماعت کے کام کا کُل نہ ہو بلکہ کل کا جز ہو --- چنداں معیوب نہیں۔ دوسری طرف آپ تنظیم کے نظریاتی کردار کی سختی سے حفاظت کا کام جاری رکھیں اور اشتراک عمل کے لئے جماعت کے ساتھ مزید قربت کی کوشش کریں تو بہت ممکن ہے کہ جماعت کے اندر آپ کی توانا آواز پر لبیک کہتے ہوئے ایک ایسی "قوت" وجود میں آجائے جس کے سامنے سب اس بات پر مجبور ہوں کہ اب خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا کام ہو گا تو صرف اور صرف منہاجِ نبویؐ کے اصولوں پر .... محترم ڈاکٹر صاحب! "اشتراک عمل" کیا مجھے تو "انضمام" تک کے امکانات نظر آتے ہیں۔

(۲) منفی ردعمل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ عام لوگوں میں انقلابی دعوت کا کام جمود کا شکار ہو گیا ہے' چاہے یہ دعوت جماعت کی ہو یا تنظیم کی طرف سے۔ تبلیغی جماعت میں سال بہ سال اضافہ ہوتا ہے۔ میری نظر میں یہ آبادی کے تناسب سے بڑھنے والا اضافہ ہے۔ ساتھ ہی آپ دیکھتے ہیں کہ منکرات و فواحش بھی سال بہ سال بڑھ رہے ہیں۔ اس پر کلام کی کوئی ضرورت نہیں' خود آپ کی تحریریں اس سے بھری پڑی ہیں۔ تبلیغی جماعت کی تمام خوبیوں

کے باوجود نہی عن المنکر کا کوئی پروگرام نہ ہونے کی وجہ سے اقامتِ دین کی آرزو اس جماعت سے وابستہ کرنا بے کار ہے۔ جماعت اسلامی کا جہاں تک تعلق ہے بس ایک نسلی جماعت اسلامی آگے بڑھ رہی ہے جس میں باپ' بیٹوں کو کچھ "سیاسی وابستگیاں" منتقل کر رہے ہیں۔ دینی کردار کا رنگ غائب تو نہیں البتہ روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ صرف ایک امید ہے کہ چونکہ بات سننے کے لئے ایک خاصا وسیع پلیٹ فارم موجود ہے' اگر کوئی صحت مند آواز ان تک اقامت دین کی صحیح فکر پر مبنی دعوت پہنچا دے تو صدیوں کا کام برسوں اور برسوں کا کام مہینوں میں ممکن ہے۔

تنظیم اسلامی کے قیام کو بھی کم و بیش ۲۰ سال ہو گئے ہیں۔ خود آپ کی تحریروں میں نظر سے یہ بات گزری ہے کہ آپ نے فرمایا تھا "اگر تنظیم کی دعوت پر اب تک لوگوں کے رد عمل کی طرف دیکھا جائے تو مجھے بالکل مایوس ہو کر بیٹھ جانا چاہئے لیکن یہ کام میں خالص خدا کے بھروسے پر کر رہا ہوں"۔ آپ کئی بار فرما چکے ہیں کہ جماعت اگر اپنے قبل از تقسیم طریقہ کار پر قائم رہتی تو آٹھ' دس سالوں میں نقشہ ہی تبدیل ہوتا۔ لیکن جب آپ نے خود منہاج نبویؐ کی بنیاد پر تنظیم اسلامی قائم فرمائی تو آج بیس سال کے بعد بھی یہ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ وہ تنظیمی ڈھانچہ اور مطلوبہ قوت فراہم نہ کی جا سکی جو اس ملک میں مثبت تبدیلی لانے کے لئے کارگر ہو۔ سالانہ اجتماعات میں سال بہ سال معمولی کمی بیشی' یا آپ کے بعض پروگرامات میں لوگوں کی کثرت شرکت وغیرہ اس بات کی دلیل نہیں کہ تنظیم کی دعوت میں "غیر معمولی" اضافہ ہوا ہے یا ہو رہا ہے۔ اس قسم کے سوالات آپ کے سامنے ہوئے ہیں اور آپ برملا اعتراف حقیقت کر چکے ہیں۔ میری نظر میں اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں کہ خدانخواستہ آپ کے اخلاص میں کوئی کمی ہے یا آپ کے طریقہ کار میں کوئی غیر اسلامی "ملاوٹ" یا جھول ہے'.... بلکہ جس طرح آپ نے دوران ملاقات فرمایا تھا کہ افغانستان میں موجودہ خون ریزی وہاں کی اسلامی قوتوں کا جہاد کے کام کو منظم نہ کرنے اور ایک امیر کی اطاعت میں جمع نہ ہونے پر خدا کی طرف سے سزا ہے۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے درمیان اتفاق رائے اور اشتراک عمل نہ ہونے پر خدا کی طرف سے سزا یہ ہے کہ دعوتِ دین کے کام پر ایک جمود طاری ہے۔ کفر کی طاقتیں ہمارے درمیان افتراق و انتشار پر خندہ

زن ہیں۔ ایک عام کارکن اور خادم دین تمام تر خلوص اور نیک نیتی کے باوجود بے بس و لاچار کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا ہے۔ مجھے خوف ہے کہ اگر دینی جماعتوں کے سربراہوں اور قائدین نے ہوش کے ناخن نہ لئے اور اتحاد و یک جہتی کے لئے کوئی راہ نہ نکالی تو دین کی دعوت دینے والا ایک عام کارکن یا تو مایوس ہو کر بیٹھ جائے گا یا ردعمل کے طور پر کارکنوں میں قائدین کے خلاف شدید نفرت و بغض پیدا ہو گا جو دعوت دین کے کام کے لئے خطرناک ہی نہیں مہلک و تباہ کن ہے۔ رہے "عام لوگ" تو اس بات کو دل سے نکالنا چاہئے کہ انتشار و افتراق کی اس انارکی میں عام آدمی ہماری آواز پر لبیک کہے گا۔ فرض کریں یہ دونوں باتیں نہ بھی ہوں اور اسلامی جماعتوں کا دعوتی کام اس موجودہ نہج پر جاری بھی ہو تو چیونٹی کی چال چلنے والی یہ "حرکت" نہ تو منزل مقصود پر پہنچا سکتی ہے اور نہ یہ کام نتائج کے اعتبار سے کسی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ مجھ سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ مسلمان دین کے کام رضائے الٰہی کی خاطر کرتا ہے اور اس کی اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے۔ دنیا میں وہ "نتائج" حاصل کرنے کی خاطر اقامت دین کے کام میں سنتِ نبویؐ سے انحراف نہیں کر سکتا۔ لیکن کیا صرف طریقہ کار کے معاملے پر ہر چھوٹے بڑے اختلاف کے نتیجے میں اپنے گرد الگ دائرہ کھینچنا اور ڈیڑھ اینٹ کی مسجد تعمیر کرنا خدا کے ہاں پسندیدہ عمل ہو سکتا ہے؟ اس پر دنیا و آخرت میں کوئی سزا و باز پرس ہو گی یا نہیں؟

محترم ڈاکٹر صاحب! عمر، فہم و بصیرت، علم اور زہد و تقویٰ میں میرے اور آپ کے درمیان کوئی نسبت نہیں۔ اپنی کم مائیگی کا احساس اتنا غالب ہے کہ اس خط کو آپ کی طرف روانہ کرنے کا حوصلہ بھی اپنے اندر نہیں پاتا۔ میں اس خط میں تحریر شدہ ان تمام باتوں کے لئے آپ سے تہہ دل سے معذرت خواہ ہوں جو یا تو میری لاعلمی سے نوک قلم پر آ گئی ہوں یا جن سے کسی طرح آپ کی دل آزاری ہوئی ہو۔ اگر میری آپ سے ملاقات نہ ہوتی اور ملت اسلامیہ کے لئے آپ کے دردمند دل کی تڑپ کو میں قریب سے محسوس نہ کرتا تو شاید مجھ میں اس خط کے لکھنے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ آج کل جماعت اسلامی اور تنظیم اسلامی کے درمیان کسی اشتراک عمل کے لئے فضا نہایت سازگار ہے۔ میں مانتا ہوں کہ جماعت کی موجودہ قیادت تو جماعت کو خالص قومی سیاسی جماعت کی راہ پر

ڈالنے کی کوشش کر رہی ہے لیکن میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ جماعت کے اندر ایک نہایت قوی رد عمل بھی پیدا ہو رہا ہے۔ آپ نے پچھلے دو تین سال میں دیکھا کہ جماعت کے اندر انتہائی بڑے قسم کے فیصلے بھی ہوئے اور کچھ بڑے فیصلے منسوخ بھی ہوئے۔ یعنی جماعت پہلے کی طرح صامت و ساکت نہیں' اس پیچ و تاب سے خیر برآمد ہونے کی مجھے قوی امید ہے۔ اگر آپ اخلاص و حکمت کے ساتھ اپنی مساعی جاری رکھیں تو۔

کیا عجب "تیری" نواہائے سحر گاہی سے
زندہ ہو جائے وہ آتش کہ "اس" خاک میں ہے

مجھے ایک "حرص" یہ بھی ہے کہ اس اتحاد کے لئے موزوں ترین وقت یہی ہے کہ آپ خود امیر تنظیم اسلامی و سرپرست اعلیٰ کی حیثیت سے خدا کے فضل و کرم سے بقید حیات ہیں۔ فہم و بصیرت اور حکمت و دانش کی جس بلوغت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات گرامی کو نوازا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ مجھے یہ تلخ حقیقت بیان کرنے میں کوئی باک نہیں کہ آپ جیسی نابغہ روزگار شخصیت کے لئے تنظیم بھی برسوں ترستی رہے گی اور ع

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا!

بڑے فیصلے جتنی آسانی سے آپ کر سکتے ہیں آئندہ کسی اور کے لئے ممکن نہیں ہو گا۔ اگر آپ عمر کے اس حصے میں پاکستان کی ان تین دینی تحریکوں (جماعت اسلامی' تنظیم اسلامی اور تحریک اسلامی) کے درمیان اشتراک عمل کا کوئی کامیاب اور قابل عمل فارمولا پیش کر سکیں اور ایک داعیٔ حق کو اعدائے اسلام کی جانب سے ملنے والے انتشار و افتراق کے طعنوں سے نجات دلا سکیں تو مجھے یقین ہے کہ دعوت دین کے کام میں موجود جمود ٹوٹ جائے گا اور بجائے خود یہ کارنامہ مسلمانان پاکستان کے لئے خصوصاً اور ملت اسلامیہ کے لئے عموماً ایک معجزے سے کم نہیں ہو گا۔

خدا ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

خاکسار' محمد فاروق
بیوٹی گفٹ سنٹر' مین بازار' چوک' منگورہ' سوات
۱۸/ نومبر ۱۹۹۵ء

امیر تنظیم کا جواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۳۶۔کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

۲۱/جنوری ۱۹۹۶ء

محترمی برادرم محمد فاروق صاحب' وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'

آپ کے ۱۸/نومبر کے خط کا جواب ۲۱/جنوری کو یقیناً بہت تاخیر سے ہے۔ تو اگرچہ یہ تاخیر کسی "باعثِ تاخیر" کے بغیر نہ تھی' تاہم معذرت خواہ ہوں!

آپ نے میرے لئے جن اعلیٰ خیالات اور نیک جذبات و خواہشات کا اظہار کیا ہے ان پر تو ندامت اور شرمندگی کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ادھر خود آپ کے جذبات و خیالات سے میں بہت متاثر ہوا اور میرے اس دیرینہ خیال کو تقویت حاصل ہوئی کہ اسلامی جمعیت طلبہ نے جس جذبہ و فکر کی تخم ریزی کثیر التعداد نوجوانوں میں کی ہے ان میں سے ان شاء اللہ العزیز معتدبہ تعداد دعوت و اقامتِ دین کی انقلابی جدوجہد کے لئے از سرنو کمربستہ ہو جائے گی۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز!

آپ نے جو خیال سب سے زیادہ شد و مد کے ساتھ پیش فرمایا ہے---یعنی یہ کہ اگر وہ لوگ جو ۵۸ء۔۵۷ء میں جماعت سے علیحدہ ہوئے اختلاف رائے کے باوجود جماعت میں شامل رہتے تو جماعت اسلامی موجودہ انجام سے دوچار نہ ہوتی اور وہ لوگ جلد یا بدیر جماعت کو اس کے اصل انقلابی کردار کی طرف لوٹا لے جانے میں کامیاب ہو جاتے---اس سے قبل بھی بہت سے مخلص اور دردمند بہی خواہان دین و تحریک کی جانب سے سامنے آیا ہے' لیکن اصلاً یہ ایک بہت بڑے مغالطے پر مبنی ہے!

یہ مغالطہ اب سے چالیس سال قبل (۵۶۔۵۵ء) کی جماعت اسلامی کو آج کی جماعت پر قیاس کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ آج جماعت میں اختلافِ رائے کا اظہار جس مادر پدر

آزاد انداز میں رواج پا گیا ہے اس کا کوئی تصور تک اُس وقت نہیں کیا جا سکتا تھا۔

چنانچہ ۱۹۵۷ء (فروری) کے اجتماع ماچھی گوٹھ میں جماعت کی موجود الوقت پالیسی سے اختلاف رکھتے ہوئے بھی جماعت میں شامل رہنے کی جو اجازت "بہ اندازِ خسروانہ" عنایت فرمائی گئی تھی وہ اس شرط کے ساتھ مشروط تھی کہ وہ اپنے اختلاف کا اظہار تحریر و تقریر تو کجا، نجی گفتگوؤں میں بھی نہیں کر سکتے، خواہ وہ نجی گفتگو ئیں ارکان جماعت سے ہوں خواہ غیر ارکان سے --- مزید بر آں اپنے اس اختلاف کا اظہار انہیں ارکان کے بھی نہ مقامی اجتماع میں کرنے کی اجازت ہو گی نہ حلقہ وار اجتماعات میں ---- بلکہ یہ کام صرف "آل پاکستان اجتماع ارکان" میں ہی کیا جا سکے گا۔ (جس کی FREQUENCY اور دورانیہ معلوم ہے۔)

اب آپ خود ہی غور فرمالیں کہ ----۵۷ء سے ۷۱ء تک کے چودہ سالوں کے دوران جب مولانا مودودی مرحوم کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، کیا ننانوے فیصد امکان اس کا نہیں تھا کہ اختلاف رکھنے والے لوگوں کے ضمن میں مندرجہ ذیل دو صورتوں میں سے ایک واقع ہو جاتی :

ایک یہ کہ اگر بربنائے طبع بشری اس قدر سخت اور غیر فطری "ڈسپلن" کی پابندی میں کبھی بھولے سے بھی کوئی رخنہ پیدا ہو جاتا تو جماعت کی "بیوروکریسی" فوراً "ڈسپلنری ایکشن" لے کر اخراج کر دیتی، جیسا کہ فی الواقع جماعت کے ایک نہایت پرانے اور اہم کارکن بلکہ رہنما مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب کے ساتھ ہوا۔

دوسرے یہ کہ اتنے شدید "حبس" کے نتیجے میں "گھٹ کے مرجاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے!" کے مصداق اختلاف رکھنے والوں کی معنوی موت واقع ہو جاتی اور ان کی شخصیتوں میں ع "خاک ہو جائیں گے ہم ان کو خبر ہونے تک!" والی صورت پیدا ہو جاتی! یعنی یا ان کی ذہنیت ہی نہ صرف تبدیل بلکہ مسخ ہو جاتی یا ان کی قوتِ ارادی اور قوتِ عمل سسک سسک کر دم توڑ دیتی!

اس سلسلے میں آج سے چار پانچ سال قبل کا ایک واقعہ یاد آیا۔ رمضان مبارک کا مہینہ تھا، عصر کی جماعت میں اکیڈمی کی مسجد میں سید اسعد گیلانی مرحوم سمیت کئی اہم ارکان

جماعت لاہور شریک ہوئے۔ نماز کے بعد سب لوگ رخصت ہو گئے' لیکن پھر فوراً ہی ملک محمد اسلم صاحب جو جماعت کے ایک نہایت پرانے اور فعال کارکن ہیں میرے پاس آئے اور انہوں نے بتایا کہ دراصل اس وقت ان کے مکان پر لاہور کی شوریٰ کا اجلاس ہو رہا ہے جو افطار تک ختم ہو جائے گا اور اسعد گیلانی صاحب کی خواہش ہے کہ آپ ہمارے ساتھ افطار کریں۔ میں نے کسی قدر پس و پیش کے بعد دعوت قبول کر لی اور عین افطار کے وقت ملک صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ افطار کے بعد نشست ہوئی تو متعدد حاضرین نے مجھ سے یہی سوال دریافت کیا کہ آپ اپنے اختلاف کے باوجود جماعت میں شامل کیوں نہ رہے؟ ان مستفسرین میں سے بھی اکثر لوگ ماچھی گوٹھ کے بعد کی نسل سے تعلق رکھتے تھے اور انہیں متذکرہ بالا پس منظر معلوم نہیں تھا۔ لیکن اسعد صاحب کی موجودگی میں جب میں نے وضاحت کی تو سب حضرات نے خاموشی اختیار کر لی۔

آپ نے اپنے حسن نظر کے مطابق میری "مساعیٔ جمیلہ" کے مثبت پہلوؤں کا تذکرہ کرنے کے بعد دو منفی پہلو گنوائے ہیں۔ ان میں سے پہلا تو بہت عام ہے اور دین کے داعی ہر فرد یا جماعت کو لازماً پیش آتا ہے' اس لئے کہ ہر نئی یا پرانی جماعت اپنی تاسیس کے وقت "حادث" ہوتی ہے اور اس طرح پہلے سے موجود تنظیموں یا جماعتوں کی تعداد میں لامحالہ اضافے کا سبب بنتی ہے۔ گویا یہ تو تمدن انسانی کی ناگزیر مشکل ہے' جسے ذرا آگے بڑھائیں تو اس شکل میں بھی سامنے آتی ہے کہ دنیا میں اتنے ڈھیر سارے مذاہب اور فلسفوں کی موجودگی میں ایک طالب حق اور متلاشی ہدایت کا کام کتنا مشکل اور کٹھن ہے!!

البتہ دوسری بات کے ضمن میں یہ گزارش ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ میری بیس سالہ تنظیمی مساعی اور اس سے بھی قبل لگ بھگ دس سال کی خالص ذاتی مساعی کے نتائج کے بہت کم ہونے' لیکن اس کے مقابلے میں اگر جماعت اسلامی اپنے اصل انقلابی طریق کار پر قائم رہتی تو اس کے ضمن میں میری اس رائے کے اسباب میں 'کہ" آٹھ دس سالوں میں نقشہ ہی تبدیل ہو جاتا" جہاں میری اور مولانا مودودی مرحوم کی صلاحیتوں کے مابین زمین

اور آسمان کے فرق کو بھی عمل دخل حاصل ہے' وہاں ایک اہم عامل یہ بھی ہے کہ مولانا مرحوم کو اقامت دین کی جدوجہد کے لئے میدان بالکل صاف ملا تھا۔ اس لئے کہ اس میدان میں ان کے پیش رو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جب اپنا رخ "حزب اللہ" سے ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست اور جہاد حریت کی جانب موڑا تھا تو حزب اللہ کی بساط بالکل تہہ کردی تھی چنانچہ نہ صرف یہ کہ اختلاف وافتراق کی کوئی صورت اور اس سے پیدا شدہ تلخیوں کا لمبا چوڑا سلسلہ پیدا نہیں ہوا تھا (دیکھئے میری تالیف: "تاریخ جماعت اسلامی کا گمشدہ باب) بلکہ مولانا آزاد کے بہت سے سرپرست اور عقیدتمند فوری طور پر مولانا مودودی مرحوم کے گرد جمع ہو گئے تھے (جیسے مستری محمد صدیق" ' ملک نصراللہ خان عزیز" ' شیخ قمرالدین مرحوم وغیرہم)--- جبکہ اس کے مقابل میں مولانا مودودی مرحوم نے پوری جماعت اسلامی سمیت اپنا رخ پاکستان کی قومی سیاست کی جانب کر لیا تھا۔ گویا بھارت' پاکستان' بنگلہ دیش وغیرہ میں جماعت اسلامی ایسی مضبوط وتوانا' اور وسیع حلقہ اثر اور طویل تاریخی پس منظر کی حامل جماعتوں کی موجودگی میں جو اپنی جگہ "اقامتِ دین" ہی کی دعویدار تھیں' اسی مقصد اور اسی اساسی فکر کے ساتھ نئی دعوت اور تنظیم کا پنپنا ہرگز آسان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بات کے سمجھنے میں لوگوں کو دیر لگی۔ (جبکہ اس الجھن پر مستزاد بعض "کرم فرماؤں" نے میری کردار کشی کے لئے جملہ جدید وسائل تشہیر اور ذرائع ابلاغ کا استعمال بھی بھرپور طریقے پر کیا!)

تاہم اب' آپ کی طرح' میرا بھی خیال یہ ہے کہ فضا صاف ہو رہی ہے اور ایک جانب غلط فہمیوں اور مغالطوں کا گرد و غبار چھٹ رہا ہے' تو دوسری جانب "بعد از خرابیٔ بسیار" ہی سہی بہرحال جماعت کے اکثر ارکان اور کارکنوں پر ۱۹۵۱ء سے جاری سیاسی طریق کار کا لاحاصل ہونا واضح ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی چوبیس سالہ اور تنظیم اسلامی کی بیس سالہ تاریخ میں پہلی بار اپنے "حقِ استرداد" (VETO) کا استعمال کرتے ہوئے' اگست ۹۵ء میں جماعت اسلامی' تحریک اسلامی' اور

تنظیم اسلامی کے مابین وفاق کے قیام کی تجویز پیش کی۔ (ہماری مرکزی مجلس شوریٰ میں اس کے حق میں ۱۴ ووٹ تھے' جبکہ مخالفت میں ۱۸ تھے۔ اور یہ ایک نہایت واضح مثال ہے اس امر کی کہ عہد حاضر کی جمہوری اور دستوری تنظیمیں کس طرح اپنے اپنے خول میں بند ہو جایا کرتی ہیں۔ اور بیعت کی ٹھیٹھ اسلامی اساس کتنی بابرکت اور انقلابی جدوجہد کے لئے سازگار ہے۔)

میری اس پیشکش پر جماعت یا تحریک کے مراکز واقع لاہور سے تو کوئی سرکاری ردعمل تاحال سامنے نہیں آیا۔ لیکن کچھ مثبت آوازیں شمال اور جنوب سے سنائی دی ہیں۔ چنانچہ کراچی سے جماعت کے ایک اہم رہنما نے اپنے نام کے اخفاء کی تاکید کے ساتھ اپنے ذاتی اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ اسی طرح اسلام آباد سے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز کے سرکاری مجلے "دینی صحافت" نے اس پر خلاف توقع بہت مثبت رویہ اختیار کیا ہے۔ مزید شمال سے آپ کا ردعمل بھی سامنے آیا ہے' اور سوات ہی سے خواجہ عبدالباری صاحب کی بھی

امیر تنظیم کے تجزیئے پر ماہنامہ "دینی صحافت" کا ادارتی نوٹ

حالیہ سالوں میں سیاسی جماعتوں میں بوجوہ تقسیم در تقسیم کے عمل میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ ان اسباب میں سے ایک ہے' جن سے عوام میں دینی قوتوں کا اثر و نفوذ کم ہوا اور نفاذ اسلام کے میدان میں پیش رفت تو کجا' انہیں اب اپنے وجود کے تحفظ کا سامنا ہے۔ دینی قوتیں سالہا سال سے جن اختلافات کی لپیٹ میں ہیں' وہ فقہی' مسلکی اور کسی اصولی موقف کے حوالے سے کس حد تک ناگزیر ہیں' تنظیم اسلامی کے راہنما ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک جرات مندانہ جائزے میں اسی صورتحال کا جائزہ لیا ہے اور دینی جماعتوں کے اتحاد کے لئے تجاویز پیش کی ہیں۔ ان کے تجزیئے کا انداز علمی' تحقیقی اور تاریخی ہے۔ اس میں شائستہ اور شستہ زبان استعمال کی گئی ہے اور کسی پر طنز یا چوٹ نہیں کی گئی۔ ریکارڈ کے حوالے سے کئی باتوں میں ان سے اختلاف ممکن ہے' تاہم اس پر ردعمل کا جذباتی (بلکہ ایک دو جرائد میں ناشائستہ) رویہ مناسب نہیں۔ ایسی تحریریں وقت کی ضرورت ہیں۔ دینی جرائد کو اس موضوع پر اب کھل کر اظہار خیال کرنا چاہیئے۔ صرف سیاسی جماعتوں میں ہی خلا نہیں ہیں' دینی جماعتوں میں بھی بہت ہیں۔ ان کا سامنا کئے بغیر تو بات نہیں بنے گی اور نہ ان کی پالیسیوں کو زیر بحث لائے بغیر اصلاح احوال کی کوئی صورت بن پائے گی ....."

(ماہنامہ دینی صحافت' جنوری ۹۶ء)

"نیمے دروں نیمے بروں" ہی سہی بہرحال کسی نہ کسی درجہ میں مثبت رائے سامنے آئی ہے۔ فضا کے صاف ہونے اور تعصبات کے پردے ہٹنے کی علامات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کچھ عرصہ قبل کراچی میں جماعت کے ادارۂ معارف اسلامی کے انگریزی مجلہ نے سندھ کے مسئلہ پر نہ صرف یہ کہ میری رائے کی میرا نام لے کر بھرپور تائید کی' بلکہ نام لئے بغیر قاضی حسین احمد صاحب کے موقف کی تردید ہی نہیں تضحیک بھی کی۔ اسی طرح روزنامہ "جسارت" کے ایک مضمون نگار نے بھارت کے ساتھ تعلقات کے ضمن میں وہ ساری باتیں اپنی ایک تحریر میں جمع کر دیں جو میں نے گزشتہ دس سالوں کے دوران وقتاً فوقتاً کہی ہیں!

بہرحال مجھے یقین ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت' مشیت اور تدبیر میں قیامت سے قبل اسلام کے موعودہ عالمی غلبے کے ضمن میں پاکستان کا کوئی رول ہے تو بیسویں صدی عیسوی کی برعظیم پاک و ہند کی تحریک اسلامی کے ان تین تنظیمی سلسلوں سے وابستہ باہمت اور اولو العزم لوگ کسی نہ کسی صورت میں ضرور یکجا ہوں گے۔ اور میرا گمان ہے کہ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کے مصداق' احیائے اسلام اور اقامتِ دین کی یہ تدریجی جدوجہد جو اس وقت "اولمپک ٹارچ" کے مانند چوتھی نسل کے ہاتھ میں ہے' ان شاء اللہ العزیز' اگلی نسل میں ضرور کامیابی سے ہمکنار ہو گی! (دیکھئے میری تالیف "برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل" کا باب چہارم)

اس ضمن میں جو ذمہ داری آپ ایسے باشعور اور دردمند نوجوانوں پر عائد ہوتی ہے اس کے ضمن میں آپ کو زیادہ سے زیادہ عملی پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے۔ میری شدید خواہش تھی کہ آپ سے جلد دوبارہ ملاقات ہو لیکن اس وقت میں پھر بیرون ملک سفر کے لئے پابہ رکاب ہوں' جس کے دوران غالباً میرا گھٹنوں کی REPLACEMENT کا خاصا بڑا آپریشن بھی ہو گا۔ بصورت زندگی واپسی پر ملاقات ہو گی۔ دوسری صورت میں بھی افراد تو اپنی جگہ اہم ہوتے ہوئے بھی غیر اہم ہوتے ہیں' ان سے کہیں اہم ترجماعتیں اور تنظیمیں ہوتی ہیں' اور ع "جو تجھ سے' مجھ سے عظیم تر ہے!" کے مصداق سب سے بڑھ کر اور اہم ترین شے تحریک ہوتی ہے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق اپنی زندگی تحریک

اسلامی کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں کھپا دی ہے۔ اب یہ آپ جیسے لوگوں کا کام ہے کہ میدان عمل میں آئیں اور تن من دھن کے ساتھ مصروف کار ہو جائیں۔ فقط والسلام مع الاکرام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

قرآن کالج لاہور کے تدریسی نظام میں تبدیلیاں

☆ قرآن کالج کے نصاب سے بی اے تربیتی سال کو ختم کر دیا گیا ہے اور فیصلہ کیا گیا ہے کہ انٹر کے نتیجے کا انتظار کئے بغیر یکم جولائی سے بی اے سال اول میں داخلے کے امیدواروں کی تدریس کا آغاز کر کے انہیں عربی' تجوید اور منتخب نصاب وغیرہ کی تعلیم دی جائے اور تین ماہ بعد قرآن کالج سے انٹر پاس کرنے والے طلبہ کی بی اے سال اول کلاس میں انہیں شامل کر دیا جائے۔

☆ رجوع الی القرآن کورس کی تدریس کا آغاز بھی یکم جولائی سے کیا جائے گا۔ اس طرح یہ کورس گیارہ ماہ میں مکمل ہو جایا کرے گا۔

☆ جولائی ۱۹۹۶ء کو رجوع الی القرآن کلاس میں خواتین کو داخلہ نہیں دیا جائے گا۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج لاہور

قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی سے عمومی استفادے اور عربی زبان کی تحصیل کے لئے

خط و کتابت کورس

(زیر اہتمام : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور)

میں داخلہ لیجئے اور گھر بیٹھے قرآن حکیم کی رہنمائی اور عربی زبان کی تدریس سے فائدہ اٹھایئے

ہر دو کورس کے پراسپکٹس' داخلہ فارم اور دیگر تفصیلات شعبہ خط و کتابت کورس' قرآن کالج' ۱۹۱۔ اناترک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن لاہور سے طلب کریں

نفاق کی نشانیاں (۲)

تالیف : فضیلۃ الشیخ الاستاذ عائض عبداللہ القرنی

ترجمہ و حواشی : ابوعبدالرحمن شبیر بن نور

پانچویں نشانی

عبادات میں سستی کا مظاہرہ کرنا

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوا كُسَالٰى﴾

(النساء : ۱۴۲)

"اور جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو کسمساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں"۔

اور جب تم کسی انسان کو دیکھو کہ وہ نماز سے' یا پہلی صف سے' یا ذکر الٰہی سے' یا دعوت دین سے یا علم سے یا نیکی کی محفلوں سے سستی کرتا ہے تو یقین جانو کہ اس کے دل میں شیطانی وسوسہ موجود ہے اور شیطان اس کے دل میں انڈے بچے دینا چاہتا ہے' لہٰذا اسے خبردار و ہوشیار ہونا چاہئے۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ جو نماز پڑھے وہ نفاق سے پاک ہے' کیونکہ منافق بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ لیکن منافقوں والی نماز کی نشانی کسل و سستی ہے۔ وہ سستی کے ساتھ اور بوجھل قدموں سے نماز کے لئے اٹھتے ہیں' وہ چستی اور نشاط سے خالی ہوتے ہیں' جبکہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :

﴿يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ﴾ (مریم : ۱۲)

"اے یحییٰ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھام لے"۔

ادھر منافقوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ گھسٹتے پاؤں کے ساتھ مسجد جاتے ہیں گویا کہ ان کے پاؤں

میں بیڑیاں ہیں اور بیڑیوں کے بوجھ سمیت قدموں کو بمشکل ہی گھسیٹ رہے ہیں۔ تم انہیں صف کے کونے میں یا مسجد کے آخر میں دیکھو گے۔ انہیں کچھ خبر نہیں کہ امام نے کیا پڑھا ہے' نہ ہی وہ اس پر غور کر سکتے ہیں اور نہ ہی ان کی سمجھ میں آتا ہے۔ شاعر نے ایسے آدمی کے بارے میں سچ کہا ہے :

ڈری اور گھبرائی ہوئی آنکھوں سے کہہ دو کہ سورج کی بھی آنکھیں ہیں۔ وہ طلوع ہوتے اور غروب ہوتے انہیں بخوبی دیکھ لیتا ہے۔

جن آنکھوں کے نور کو اللہ ختم کر چکا ہے انہیں معاف کر دو' نہ تو وہ ٹھیک ہو سکتی ہیں اور نہ کسی چیز کو صحیح صحیح دیکھ سکتی ہیں۔

حضرت اسود بن یزید العراقی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ حضور اکرم ﷺ تہجد کے لئے کس وقت اٹھتے تھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتلایا : جب مرغ اذان دیتا تو آپ بیدار ہو جاتے"۔ مزید فرمایا : "آپ اچھل کر اٹھتے تھے"۔ یہ نہیں فرمایا کہ آپ ﷺ تہجد کے لئے اٹھ جاتے تھے بلکہ فرمایا : اچھل کر اٹھتے تھے۔ {۱} آپ کا اس طرح اٹھنا حوصلے' ہمت' چستی' حرارتِ ایمانی اور قوتِ ارادہ کی ترجمانی کرتا ہے۔ آپؐ عبادت کے لئے ہمیشہ قوتِ ایمانی اور جذبۂ اطاعت کے ساتھ تشریف لاتے۔ اسی لئے ہر نیک آدمی کو تم دیکھ گے کہ وہ بار بار اپنی گھڑی پر وقت دیکھتا رہتا ہے کہ کب اذان ہوتی ہے؟ کیا نماز کا وقت قریب تو نہیں ہو گیا؟ پھر وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

حضرت امام احمد نے حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا ہے' وہ فرماتے ہیں کہ "قسم بخدا' نماز کا وقت ہونے سے پہلے ہی میں بصد شوق تیار بیٹھا ہوتا ہوں"۔ {۲}

حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ اپنے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ : چالیس سال تک معاملہ یہ رہا ہے کہ جب موذن اذان دیتا تو میں اس وقت مسجد نبوی میں موجود ہوتا {۳}۔

{۱} صحیح مسلم - کتاب المسافرین - باب صلاۃ اللیل والوتر

{۲} کتاب الزھد' ترجمہ عدی بن ابی حاتم رضی اللہ عنہ - ص ۲۵۰

{۳} کتاب الزھد' ترجمہ سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ - ص ۴۵۸-۴۵۹ - ایک دوسرے موقعہ پر

قسم بخدا ایمان اسی کا نام ہے۔ جب تم کسی کو پہلی صف اور بالخصوص امام کے قریب والی جگہ پر دیکھو تو اس کے حق میں ایمان کی گواہی دو۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا :

((مَنْ رَأَيْتُمُوهُ يَعْتَادُ الْمَسْجِدَ فَاشْهَدُوا لَهُ بِالْإِيمَانِ))

"جس آدمی کو تم مسجد میں آتا جاتا دیکھو اس کے ایمان کی گواہی دو"۔ {۴}

اگرچہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف ہے لیکن اہل علم کے نزدیک اس کا مفہوم صحیح ہے۔ جو آدمی لگاتار اور مسلسل مسجد میں آتا رہے ان شاء اللہ وہ نفاق اعتقادی سے پاک ہے۔ اب اس کی ذمہ داری ہے کہ اپنے آپ کو نفاق عملی سے بھی پاک رکھے۔

میرے دینی بھائیو! سستی نفاق کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ نشانی نماز' روزہ' ذکر' عبادت' مفید علمی دروس اور دعوت دین کے موقع پر نمایاں ہوتی ہے۔ انسان کو چاہئے اپنے بارے میں چوکنا رہے اور سستی کو اپنے قریب تک نہ پھٹکنے دے۔ اللہ کی قسم یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔ اسی سستی کو تو اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی نشانی بتلایا ہے۔ والعیاذ باللہ!

چھٹی نشانی

دکھلاوے کی خاطر عبادت کرنا

اللہ تعالیٰ منافقوں کے بارے میں فرماتا ہے :

﴿يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ۝﴾

(النساء : ۱۴۲)

"محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر (عبادت کرتے ہیں) اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں"۔

آپ نے فرمایا : "چالیس سال تک کوئی ایک نماز بھی جماعت سے نہیں رہی اور نہ کبھی دوسری صف میں بیٹھا ہوں اور نمازیوں سے مسجد سے نکلتے ہوئے بھی کبھی ملاقات نہیں ہوئی (یعنی ہمیشہ سب کے بعد مسجد سے نکلا ہوں)

{۴} سنن الترمذی' کتاب الایمان' باب ماجاء فی حرمة الصلاة' حدیث نمبر ۲۶۱۷۔ حدیث ضعیف ہے۔ علامہ الالبانی نے اسے بھی ضعیف قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ضعیف الجامع الصغیر وزیادہ حدیث نمبر ۵۰۹

اسی سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے :

((مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللّٰہُ بِہٖ---وَمَنْ یُرَائِی یُرَائِی اللّٰہُ بِہٖ))

"جو آدمی شہرت کے لئے نیک کام کرے گا (روز قیامت سب کے سامنے) اللہ تعالیٰ اس کو بدنام اور رسوا کر دیں گے'---اور جو آدمی دکھلاوے کے لئے نیک کام کرے گا (روز قیامت سب کے سامنے) اللہ تعالیٰ اس کا پردہ فاش کر دیں گے"۔ {۵}

دکھلاوے یا ریا کی کیا شکل ہوتی ہے؟ یہ کہ انسان لوگوں کے سامنے تو بڑے خشوع و خضوع کا مظاہرہ کرے اور تنہائی و خلوت کی نماز میں ٹھونگے مارے۔ اور جب لوگوں کے ساتھ بیٹھے تو اس پر زہد و عبادت کا رنگ نمایاں ہو' مجلس کی گفتگو کے دوران اس کی باتوں میں ادب و احترام کا مظاہرہ ہو اور ادھر تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کردہ تمام حدوں کو توڑ ڈالے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا :

((لَیَأْتِیَنَّ اَقْوَامٌ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِحَسَنَاتٍ اَمْثَالِ عَضَاۃِ تُھَامَۃَ یَجْعَلُھَا اللّٰہُ ھَبَاءً مَنْثُوْرًا)) قَالَ الصَّحَابَۃُ : یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَلَیْسُوا بِمُسْلِمِیْنَ؟ قَالَ : ((بَلٰی' یُصَلُّوْنَ کَمَا تُصَلُّوْنَ' وَیَصُوْمُوْنَ کَمَا تَصُوْمُوْنَ' وَلٰکِنَّھُمْ فُضُوْلِ اَمْوَالٍ یَتَصَدَّقُوْنَ بِھَا' وَکَانَ لَھُمْ حَظٌّ مِنَ اللَّیْلِ لٰکِنْ کَانُوْا اِذَا خَلَوْا بِمَحَارِمِ اللّٰہِ انْتَھَکُوْھَا)) {۶}

"قیامت کے روز کچھ لوگ تہامہ کے پہاڑوں جیسی نیکیاں لے کر حاضر ہوں گے' اللہ تعالیٰ انہیں راکھ بنا کر اڑا دے گا"۔ صحابہ کرام نے دریافت کیا : یا رسول اللہ ﷺ کیا وہ لوگ مسلمان نہیں ہیں؟---فرمایا "کیوں نہیں! جیسے تم نماز پڑھتے ہو ویسے ہی نماز پڑھتے ہیں اور جس طرح تم روزے رکھتے ہو ویسے ہی وہ روزے رکھتے ہیں اور

{۵} صحیح بخاری' کتاب الرقاق' باب الریاء والسمعۃ۔ صحیح مسلم' کتاب الزھد' باب تحریم الریاء

{۶} سنن ابن ماجہ' کتاب الزھد' باب ذکر الذنوب' حدیث نمبر ۴۲۲۳۔ استاذ الالبانی حفظہ اللہ نے حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ (واضح رہے کہ سنن ابن ماجہ کے الفاظ تھوڑے مختلف ہیں (مترجم)۔

اپنے اضافی مالوں سے زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں اور رات کو بھی اٹھ اٹھ کر عبادت کرتے ہیں (لیکن اصل بات یہ ہے کہ) جب تنہائی میں ہوتے ہیں تو اللہ کی مقرر کردہ حدود کو توڑ ڈالتے ہیں"۔

تو معلوم ہوا کہ منافق کی نشانی دکھلاوا ہے' لوگوں کو دکھلانے کی خاطر نیک کام کرتا ہے اور لوگوں کو دکھلانے کی خاطر ہی اچھی گفتگو کرتا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمیں دکھلاوے اور شہرت جیسے امراض سے محفوظ رکھے۔ یہ انتہائی خطرناک بیماریاں ہیں۔ جب کوئی انسان ان کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے تمام نیک اعمال ان بیماریوں کے بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا :

((اِنَّ اللّٰہَ یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ : اَنَا اَغْنَی الشُّرَکَاءِ عَنِ الشِّرْکِ' مَنْ اَشْرَکَ مَعِیَ فِی عَمَلٍ تَرَکْتُہٗ وَشِرْکَہٗ))

"اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائیں گے : حصہ داری کے معاملے میں' میں سب سے زیادہ بے نیاز ہوں' جس نے کسی کام میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک بنایا تو میں اس کو اس کے شرک سمیت چھوڑ دوں گا"۔ {۷}

اللہ تعالیٰ ایسے ریاکار کا کوئی چھوٹا بڑا عمل قبول نہیں کرے گا' حضور اکرم ﷺ نے فرمایا :

((اَلرِّیَاءُ شِرْکٌ)) {۸} "ریا شرک ہے"

نیک لوگ ریا کے خوف سے رویا کرتے تھے اور اللہ کے حضور گریہ زاری کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ وہ انہیں ریا سے محفوظ رکھے۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں ریا آ سکتا ہے' نماز میں ریا آتا ہے' ذکر الٰہی اور روزے میں ریا ہوتا ہے۔ ریا سے بچنے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہیں' الا یہ کہ مندرجہ ذیل تین اصولوں کو ہمیشہ ذہن میں تازہ رکھا جائے :

(۱) تم یہ یقین کر لو کہ نفع نقصان صرف اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کے علاوہ نہ کوئی بیماری دے سکتا ہے نہ شفاء' نہ کوئی زندہ کر سکتا ہے نہ مار سکتا ہے' نہ کوئی رزق دے

{۷} صحیح مسلم' کتاب الزھد' باب تحریم الریاء

{۸} اس مفہوم کی حدیث مسند احمد ج ۵' ص ۴۲۸ اور سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۴۲۰۴ میں مذکور ہے۔

سکتا ہے اور نہ رزق روک سکتا ہے' نہ کوئی جزا دے سکتا ہے اور نہ سزا۔

(۲) تمہیں مخلوق کی حیثیت کا علم رہنا چاہئے کہ وہ بہت کمزور اور لاچار ہے' نہ وہ کسی کے نفع و نقصان کی مالک ہے اور نہ موت و زندگی کی' اور نہ دوبارہ زندہ کرنے کا اختیار رکھتی ہے اور نہ ہی وہ جزا و سزا کی مالک ہے چنانچہ تم ہمیشہ چوکنے اور ہوشیار رہو۔

(۳) بالالتزام اور پابندی سے مندرجہ ذیل دعا پڑھا کرو۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ عمدہ دعا اپنے صحابہ کو سکھائی تھی :

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ اَنْ اُشْرِکَ بِکَ شَیْئًا وَاَنَا اَعْلَمُ وَاَسْتَغْفِرُکَ مِمَّا لَااَعْلَمُ

"اے اللہ! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جانتے بوجھتے کسی چیز کو تیرا شریک ٹھہراؤں اور جس گناہ کا مجھے علم ہی نہیں اس کی میں مغفرت چاہتا ہوں"۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ یوں دعا کیا کرتے تھے : "اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الرِّیَاءِ وَالسُّمْعَۃِ" یعنی "اے اللہ میں ریا اور شہرت کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

آپؒ کے حالات زندگی کے تذکرے میں بعض جگہ دعا کے یہ الفاظ ملتے ہیں :

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ رِیَائِیْ وَسُمْعَتِیْ

"اے اللہ! ریا اور شہرت کی خاطر میں نے جو کام کئے ہیں انہیں معاف فرمادے"۔

ریا و شہرت سے ہمیشہ بچ کر رہنا چاہئے

شہرت سے مراد یہ ہے کہ اپنا نام پیدا کرنے اور دنیا میں شہرت پانے کی خاطر انسان کوئی نیک کام کرے۔ ریاکاروں اور شہرت کے طلب گاروں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز سب کے سامنے ذلیل و رسوا کردے گا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ریا اور شہرت جیسی بیماریوں سے محفوظ رکھے۔

ساتویں نشانی

ذکرِ الٰہی میں کوتاہی

یہ منافق لوگ اللہ کو یاد ضرور کرتے ہیں لیکن تھوڑا تھوڑا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

﴿وَاِذَا قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (النساء : ۱۴۲)

"اور جب نماز کے لئے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے' محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں"۔

قرآن نے یہ نہیں کہا کہ وہ اللہ کا ذکر نہیں کرتے' ذکر ضرور کرتے ہیں' لیکن بہت تھوڑا۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ منافق بھی اللہ کا ذکر کرے' اس کے نام کی تسبیح و تہلیل کرے لیکن بہت کم ہی' کیونکہ اس کی زبان محروم لذت ہے اور اس کا دل بھی مردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی خاطر اس کی روح میں چستی نہیں ہوتی۔ حضرت ابو الدرداء بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ تِلْكَ صَلَاةُ الْمُنَافِقِ يَرْقُبُ الشَّمْسَ حَتّٰى تَدْنُوَ مِنَ الْغُرُوْبِ (وَفِي لَفْظٍ حَتّٰى تَصْفَرَّ) ثُمَّ يَقُوْمُ فَيَنْقُرُ اَرْبَعَ رَكَعَاتٍ لَا يَذْكُرُ اللّٰهَ فِيْهَا اِلَّا قَلِيْلًا)) {۹}

"یہ منافق کی نماز ہے' یہ منافق کی نماز ہے' یہ منافق کی نماز ہے۔ وہ سورج کو دیکھتا رہتا ہے جب غروب کے قریب ہو جاتا ہے (دوسری روایت میں ہے : جب پیلا ہو جاتا ہے) تو کھڑے ہو کر چار رکعت کے ٹھونگے مار لیتا ہے' ان میں اللہ کو کم ہی یاد کرتا ہے۔"

سبحان اللہ! وہ نماز پڑھتا ہے' تھوڑا بہت اللہ کا ذکر بھی کرتا ہے' اس کے باوجود منافق قرار

{۹} صحیح مسلم' کتاب الصلاۃ' باب استحباب التکبیر بالعصر

پاتا ہے۔ {۱۰} ہاں البتہ ایمان کی نشانی کثرت سے اللہ کا ذکر کرنا ہے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ "الوابل الصیب" میں فرماتے ہیں : "خواہ ذکر کا اس کے علاوہ کوئی اور فائدہ نہ بھی ہو یہی فائدہ بہت کافی ہے کہ ذکر کرنے والا نفاق سے بری ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا : کیا خارجی منافق ہیں؟ (واضح رہے کہ خارجیوں کے خلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جہاد کیا تھا) آپؓ نے فرمایا : نہیں! یہ اللہ کو بہت یاد کرتے ہیں اور منافق کی نشانی ہے کہ وہ اللہ کو کم یاد کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۝﴾ (الرعد : ۲۸)

"خبردار رہو اللہ کی یاد ہی وہ چیز ہے جس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوا کرتا ہے۔"

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ (البقرہ : ۱۵۲)

"تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔"

مزید فرمایا :

﴿اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ﴾

(آل عمران : ۱۹۱)

"جو لوگ اٹھتے بیٹھتے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔"

اور فرمایا :

﴿وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ﴾

(الاحزاب : ۳۵)

"اور جو مرد اور عورتیں اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں۔"

اور فرمایا :

{۱۰} جو دیر سے نماز پڑھے، جلدی جلدی پڑھے اور اللہ تعالیٰ کو کم ہی یاد کرے وہ تو ٹھہرا منافق اور جو بالکل نماز نہ پڑھے، ذکر اذکار کا تو سوال ہی کیا! وہ کون ہے؟ نماز سے غافل حضرات ذرا غور فرمالیں---(مترجم غفرلہ ولوالدیہ)

﴿یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا ۝﴾ (الاحزاب : ۴۱)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔"

مسلک امام شافعی کے معروف محدث علامہ ابن الصلاح سے دریافت کیا گیا : "اللہ کے زیادہ ذکر کی حد کیا ہے؟" فرمایا : "جو آدمی حضور اکرم ﷺ سے ماثور و مروی اذکار کی پابندی کرتا ہے اس نے اللہ تعالیٰ کو بکثرت یاد کیا۔" چنانچہ جو آدمی صبح و شام نماز کے بعد ماثور اذکار پابندی سے پڑھے۔ کھانے' پینے' سونے' جاگنے' بجلی کے چمکنے' بادل کے گرجنے' بارش برسنے' مسجد میں داخل ہونے اور مسجد سے نکلنے سے متعلق مروی دعائیں پڑھے' تو یقین جانو اس نے اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ آپ نے فرمایا : "جو آدمی اللہ تعالیٰ کو چلتے پھرتے' حالت قیام اور حالت سفر' صحت و بیماری اور ہر وقت یاد کرتا رہے اس نے واقعتاً اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کیا۔ کئی ایک سلف صالحین سے یہ قول مروی ہے کہ "کثرتِ ذکر" سے مراد ہے کہ مسلسل ذکر الٰہی سے تمہاری زبان تر رہے۔ حضرت عبداللہ بن بُسر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ دین کے احکام مجھے بہت زیادہ محسوس ہوتے ہیں بس مجھے کوئی ایک ایسی چیز بتا دیں جسے میں مضبوطی سے تھامے رکھوں۔ تو آپ نے فرمایا : "تیری زبان ہمیشہ ذکر الٰہی سے تر رہے" {۱۱}۔

ایک موقع پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا :

((لَئِنْ اَقُوْلُ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَیْہِ الشَّمْسُ)) {۱۲}

"اگر میں سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ کہہ لوں تو یہ مجھے ہر اس چیز سے زیادہ عزیز ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے۔ (یعنی دنیا و مافیہا سے)"۔

{۱۱} سنن الترمذی' کتاب الدعا' باب ماجاء فی فضل الذکر' حدیث نمبر ۳۳۷۵

{۱۲} صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعا' باب فضل التہلیل والتسبیح

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

((سَبَقَ الْمُفَرِّدُوْنَ' قَالُوا : وَمَا الْمُفَرِّدُوْنَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ : اَلذَّاكِرُوْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَالذَّاكِرَاتُ)) {۱۳}

"مفردون سب سے آگے رہے۔" صحابہ نے دریافت کیا : اے اللہ کے رسول' مفردون سے آپ کی کیا مراد ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا : "اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے مرد اور عورتیں"۔

برادرانِ اسلام! میں تمہیں کثرت سے ذکر الٰہی کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ ذکرِ الٰہی میں کمی کے موجب نفاق کا خطرہ ہے۔ صبح و شام کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرو۔ "سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ کی تسبیح' قرآن کی تلاوت' توبہ و استغفار اور حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر درود شریف کے ورد پر اپنے دل کو جمالو۔ ذکر و اذکار سے متعلق تین کتابیں بہت عمدہ ہیں {۱۴} (۱) الاذکار تالیف الامام النوویؒ (۲) الوابل الصیب تالیف الامام ابن القیم الجوزیہؒ (۳) الکلم الطیب تالیف الامام ابن تیمیہ رحمہم اللہ جمیعًا۔

{۱۳} صحیح مسلم 'کتاب الذکر والدعا' باب الحث علی ذکر اللہ

{۱۴} ان میں سے جو کتاب تحقیق و تخریج کے ساتھ دستیاب ہو وہ زیادہ بہتر ہے بالخصوص علامہ محمد ناصر الالبانی الاستاذ احمد محمد شاکر یا الاستاذ عبد القادر الارناؤوط کی تحقیق زیادہ وقیع اور زیادہ قابل اعتماد ہے۔ (مترجم غفرلہ ولوالدیہ ولاساتذتہ)

ڈاکٹر اسرار احمد کا نہایت اہم خطاب

جہاد بالقرآن

کتابی صورت میں دستیاب ہے

صفحات: ۹۶ سفید کاغذ، عمدہ طباعت؛ قیمت فی نسخہ -/۱۲ روپے

رمضان المبارک اور ہم

—— میم سین، کراچی ——

کہتے ہیں ایک مرتبہ مرزا غالب رمضان المبارک کے دوران ایک کمرے میں اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول تھے کہ ان کے ایک اور دوست وہاں تشریف لائے اور ازراہ تمسخر مرزا سے کہنے لگے : مرزا ہم نے تو سنا ہے کہ رمضان میں شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ مرزا نے فوراً کہا : یہ وہی کمرہ تو ہے جہاں شیطان کو قید کیا جاتا ہے۔ پتہ نہیں کیوں جب یہ لطیفہ ذہن میں آتا ہے تو اپنے ملک پر اس کمرے کا گمان ہوتا ہے جہاں مرزا نوشہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ دیکھئے نا! آج ہی اخبار میں خبر آئی ہے کہ جن اشیاء کی قیمتوں پر حکومت نے رمضان المبارک کے دوران تخفیف کا اعلان کیا تھا وہ یوٹیلٹی اسٹورز سے غائب کر دی گئی ہیں۔ غالباً یہ کام رمضان المبارک کے آغاز سے قبل اس لئے کر لیا گیا ہے کہ رمضان المبارک کے احترام میں فرق نہ پڑے۔ اور یہ رمضان المبارک کا احترام بھی عجیب فریضہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رمضان المبارک کے احترام میں ویڈیو شاپس بھی بند ہو جانی چاہئیں اور سینما ہال بھی۔ گویا کہ رمضان المبارک کے علاوہ بقیہ مہینوں میں یہ کام جائز ہیں۔ اور ہاں رمضان المبارک کے احترام میں روزوں کے ساتھ نمازیں بھی خوب خوب پڑھی جاتی ہیں۔ نمازیوں سے بھری ہوئی مسجدوں کو دیکھ کر دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کاش یہ مناظر سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں نظر آئیں۔ لیکن افسوس کہ جیسے جیسے عید الفطر قریب آتی جاتی ہے نمازیوں کی تعداد میں بتدریج کمی آتی جاتی ہے تا آنکہ شب قدر کی مبارک ساعتیں آ جاتی ہیں۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہیں رہتی۔ گویا کہ شب قدر میں چراغ گل ہونے سے قبل بھڑک اٹھتا ہے۔ اس کے بعد یہی رونقیں شاپنگ سینٹرز وغیرہ میں منتقل ہو جاتی ہیں اور کیوں نہ ہوں، عید کی

خریداری بھی تو ضروری ہوتی ہیں۔ ہماری بہنیں انہی راتوں کو نئی چوڑیوں اور اسی قسم کی دیگر اشیاء خریدنے میں مصروف نظر آتی ہیں۔ اور وجود زن سے تصویر کائنات میں رنگ کا سماں ہوتا ہے۔

دیکھئے بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ بات ہو رہی تھی شیطان کے قید کئے جانے کی۔ اور میں نے کہا تھا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے غالباً ہمارے ملک میں ہی قید کر دیا جاتا ہے۔ جبھی رمضان المبارک کے دوران اشیاء کی قیمتیں' جو عام دنوں میں آسمان پر جا پہنچتی ہیں' اس سے بھی آگے زہرہ اور مریخ کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہیں۔ ذخیرہ اندوزی اور منافع خوری کو رمضان المبارک کی بناء پر تقدس حاصل ہو جاتا ہے۔ اور آپ سے کیا پردہ' ہم بھی کبھی روزوں کو بہلانے کے لئے سینما ہالوں میں منی شو دیکھنے میں مصروف ہو جایا کرتے تھے۔ ہم تو خیر اب اپنی اس حرکت سے باز آ گئے ہیں لیکن اب تو لوگوں کو روزہ بہلانے کے لئے نہ تو سینما ہالوں کا رخ کرنا پڑتا ہے اور نہ ہی ٹکٹ کے لئے قطار میں لگنے اور لوگوں کی دھکم پیل کی مشقت برداشت کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلے ٹی وی' پھر وی سی آر اور اب ڈش انٹینا۔ آخر یہ چیزیں لوگوں کے فائدے کے لئے بنائی گئی ہیں تو کیوں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ خیر یہ تو بہت ہی عام سی باتیں ہیں۔ ان گنہگار آنکھوں نے تو رمضان المبارک کی راتوں میں وہ مناظر بھی دیکھے ہیں کہ مسلمانوں کے دو گروہ ایک دوسرے پر گولیوں کی بوچھاڑ کر رہے ہیں اور دونوں جانب سے گاہے گاہے نعرۂ تکبیر کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ کیا کیا جائے۔ مسلمان اور جہاد و قتال لازم و ملزوم ہیں۔ سقوط بغداد اور سقوط ڈھاکہ کے داغ کو بھی دھونا ہے' اس کے لئے ریہرسل ضروری ہے' سو وہ آپس میں لڑ بھڑ کر کر لیتے ہیں۔ رمضان المبارک کا زمانہ اس ریہرسل کے لئے بہترین ہوتا ہے۔ ایمانی کیفیت پورے عروج پر ہوتی ہے۔ عموماً یہ ریہرسل ۱۷ رمضان المبارک کے بعد کی جاتی ہے۔ اس سے پہلے غزوۂ بدر پر اخبارات ضمیمے شائع کرتے ہیں' سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ رمضان المبارک کے دوران نیکیاں کمانے والوں کا ایک گروہ اور ہوتا ہے۔ یہ رمضان المبارک کے پہلے دو عشروں میں تو کم کم دکھائی دیتے ہیں البتہ آخری عشرے میں یہ انتہائی سرگرم نظر آتے ہیں۔ کوئی ڈھول پیٹ رہا ہوتا ہے تو کوئی اپنی خوش آوازی کا

مظاہرہ کر رہا ہوتا ہے۔ فلمی دھنوں پر یہ "مذہبی گوئیے" (Religious Singers) لوگوں کو سحری کے لئے بیدار کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اور عید الفطر کے فوراً بعد ہی یہ بن بلائے مہمان بن کر آپ کے دروازے پر یہ یاد دلانے کے لئے حاضر ہو جاتے ہیں کہ ہم ان میں شامل تھے جن کی بدولت آپ روزہ رکھنے کے قابل ہوئے۔ اگر ہم نہ ہوتے تو یا تو آپ بغیر سحری کے روزہ رکھتے جس سے دو نقصانات ہوتے۔ اول یہ کہ آپ ایک سنت کی ادائیگی سے محروم رہ جاتے۔ دوسرے، دن بھر بھوک کی شدت برداشت کرنی پڑتی۔

قارئین اب ذرا سنجیدگی سے غور فرمائیں کہ یہ اور اس قسم کی دوسری بے شمار قباحتیں جو ہمیں رمضان المبارک کے دوران نظر آتی ہیں آخر کوئی تو سبب ہوگا ان باتوں کا۔ میں تو اتنا سمجھ پایا ہوں کہ دین کا وسیع تر تصور ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو گیا ہے جس کی بناء پر ہمارا دین مذہب بن کر رہ گیا ہے، یعنی عقائد، عبادات اور رسومات کا مجموعہ۔ معیشت، معاشرت اور سیاست تو دین سے خارج کر دیئے گئے ہیں، عقائد مسلکی اور فرقہ وارانہ بنیاد پر استوار ہو گئے ہیں، عبادات کا تصور محدود ہو گیا ہے اور ان رسومات کی بھرمار ہو گئی ہے جن کا دین سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ معیشت کو حلال و حرام کی بنیادوں پر استوار کرنا، معاشرتی حقوق کی ادائیگی اور اللہ کی حاکمیت کی بنیاد پر سیاست کا تصور ہمارے ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ عوام الناس کو تو یہ باتیں بتائی بھی نہیں جاتیں اور وہ اس آیہ قرآنی کے مصداق بن گئے ہیں "اور ان میں وہ علم نہ رکھنے والے ہیں جو کتاب کا علم نہیں رکھتے سوائے اپنی تمناؤں کے"۔ (سورۃ البقرہ، آیت ۷۸) انہیں تو تمناؤں میں الجھا کر رکھ دیا گیا ہے۔

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

کی کیفیت میں مبتلا عوام الناس جنت میں داخلے کے شارٹ کٹس کی تلاش میں الجھے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نزول قرآن کے اس مقدس مہینے میں قرآن کا مقصد نزول، اس کی افادیت، اس کا فہم اور اس پر عمل ان پر واضح کیا جائے۔ جبھی استقبال رمضان کا حق ادا ہو سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

مجھے اکثر خیال آتا ہے

طیبہ یاسمین

۱۔ ہم اپنی زبان سے کہتے ہیں "میری نماز' میری قربانی' میری زندگی اور میری موت سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لئے ہے"۔ ہمیں اس حدیث پاک کا بھی علم ہے کہ "اعمال کا اجر نیتوں کے مطابق ہے" (انما الاعمال بالنیات)۔ جب میں ان پر غور کرتی ہوں اور معاشرہ میں ان پر عمل کا مشاہدہ کرتی ہوں تو مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہمارے اعمال میں خوشنودی کا بہت سارا حصہ معاشرہ کو حاصل ہو جاتا ہے۔ غیر جانبدار ہو کر ہر عمل کا جائزہ لے کر سوچنا چاہئے کہ ہماری شادیاں' بیاہ' ہماری مہمانداریاں' ہماری نیکیاں' ہمارے حسن سلوک' ہمارے نیک اعمال لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے کے لئے ہوتے ہیں یا اللہ تعالیٰ کو خوش کرنے کے لئے؟۔ عمل تو ایک ہی ہے بات صرف نیت کی ہے۔ اگر کسی عمل میں کسی طور بھی انسانوں اور معاشرہ کی خوشنودی کا جذبہ شامل ہو تو کیا آخرت میں بھی اس کا اجر محفوظ ہو گا؟ ایسا نہ ہو کہ کہیں ہم اپنا اچھا عمل ریاکاری' مصلحت اور دوسروں کو خوش کرنے کی وجہ سے ضائع کر دیں۔ اور اللہ تعالیٰ یہ کہہ دے کہ تم تو بندوں کی خوشنودی کے لئے اچھے انسان بنے تھے' اب مجھ سے اجر کیسا؟

۲۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ اگر کوئی انسان کسی مشکل یا مصیبت میں گرفتار ہو اور اس کی ہم مدد کر دیں تو کیا وہ اس پر احسان ہو گا؟--اس کی مدد کرنا تو ہمارا فرض ہوا اور اس کا حق۔ تو کیا اپنا فرض ادا کرنا خود اپنے آپ ہی پر احسان نہیں؟ کیونکہ بصورت دیگر تو ہم اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہوں گے۔ کیا یہ دوسرے کا احسان نہیں کہ اس نے نیکی کرنے کا موقع فراہم کیا؟ شاید اسی لئے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ کسی پر احسان کر کے جتلانا اس کا اجر ضائع کر دیتا ہے۔

۳۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہمارے معاملات اور تعلقات کی بنیاد میں نفرت اتنی اہم کیوں ہے؟۔ اچھے لوگ بروں سے ہمدردی کی بجائے نفرت کیوں کرتے ہیں؟ نفرت تو برائی سے کرنی چاہئے نہ کہ اس انسان سے۔ اور اگر ہم کسی کو بھلائی کی طرف بلاتے ہیں اور وہ ہمارے حسب منشا اس کا ردعمل ظاہر نہیں کرتا تو ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ اس شخص کے برے ہونے کا فیصلہ صادر کردیں۔ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ شاید ہماری ہی کوشش اور طرز عمل میں کوئی کمی یا خامی ہو؟

۴۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں کسی کا محتاج نہ کرے۔ پھر اس بندے کی یہ دعا قبول بھی ہو جاتی ہے اور انسان اس کی مدد کو نہیں آتے لیکن دیر سویر اس کے کام ہو ہی جاتے ہیں تو پھر اس انسان کو یہ دکھ کیوں ہوتا ہے کہ فلاں انسان نے فلاں مشکل وقت میں میری مدد نہ کی۔ شاید اس کے لئے بھی بڑے ظرف اور سمجھ کی ضرورت ہے۔

۵۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ جب ہم کسی طرز عمل اور راہ کو اپنا لیتے ہیں تو پھر دوسروں سے بھی فوراً ہی یہ توقع کیوں کرتے ہیں کہ وہ ہماری بتائی ہوئی راہ اور طے کردہ اصولوں پر چل پڑے۔ ہم کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہم خود اس منزل پر بے شمار تجربوں اور مراحل سے گزرنے کے بعد پہنچے ہیں' پھر ہم دوسروں سے فوراً ہی ان سے گزرے بغیر اس منزل پر پہنچنے کی توقع کیوں کرتے ہیں؟

۶۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہم اپنی ہر بات اور ہر جذبہ کے لئے' خواہ وہ درست ہو یا غلط' جواز تلاش کر لیتے ہیں' مگر دوسروں کے لئے وہ نرم گوشہ نہیں رکھتے۔ ہم دوسرے کو بھی وہی گنجائش نہیں دیتے جو خامی خود ہم میں موجود ہو۔ ہم اپنی ہر بات کی تعریف چھپے یا واضح انداز میں کرتے ہیں مگر دوسروں کو تنقید کا نشانہ بنائے رکھتے ہیں۔ کیا اس طرح ہم اپنے حقوق سے تجاوز نہیں کرتے؟ کیا جس بے رحمی سے ہم دوسروں کا تجزیہ کرتے ہیں اس سے اپنا تجزیہ بھی کریں تو ہماری شخصیت خوبصورت تر نہ ہو جائے؟

۷۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ پر توکل سب انسانوں سے مایوس ہونے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ ایسی صورت حال پیش

آئے بغیر بھی توکل حاصل ہو۔ کیا اللہ تعالیٰ صرف ٹوٹے دل میں ہی رہ سکتا ہے' ثابت و سالم دل میں نہیں؟ اقبال بھی کہہ گئے ہیں

ع جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں!

۸۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہم دوسروں کی برائی سن کر بڑے آرام سے یقین کر لیتے ہیں مگر کسی کی تعریف سنیں تو تصدیق چاہنے لگتے ہیں اور یقین کرنے میں دیر لگتی ہے۔ کیا ہمارے لاشعور میں دوسروں سے نفرت اور ان کو کم تر سمجھنا چھپا ہوتا ہے؟

۹۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ ہمیں اپنے ادا کردہ الفاظ کی عصمت کا پاس کیوں نہیں ہوتا۔ ہم ہر بات بے سوچے سمجھے فیصلہ کن انداز میں کر دیتے ہیں۔ دوسروں کی نیتوں پر شک کر کے فیصلہ صادر کر دیتے ہیں۔ ہمیں اپنے الفاظ کا اتنا ہی یقین ہوتا ہے تو کیا کسی دنیاوی عدالت میں بھی ہم وہی بات اتنے یقین سے کہہ سکتے ہیں؟ آخرت کی عدالت میں تو مالک یوم الدین نے ہر بات اور ہر لفظ کی عصمت کا حساب لینا ہی ہے۔

۱۰۔ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ انسان دوسروں سے صرف اسی وقت ملتا ہے جب اسے اس سے کوئی کام ہی آن پڑے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ کبھی اس کا حال احوال پوچھنے بھی چل پڑے۔

رمضان المبارک کے دوران بیت اللہ شریف میں نماز وتر میں پڑھی جانے والی مفصل دعائے قنوت مع اردو ترجمہ' بعنوان:

مناجاتِ حرم

ترتیب و ترجمہ: ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

جیبی سائز میں اعلیٰ طباعت اور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ' قیمت: ۱۰ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن (۳۶۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور) پر دستیاب ہے

KHALID TRADERS

AUTHORIZED AGENTS NTN BEARINGS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

PLEASE CONTACT

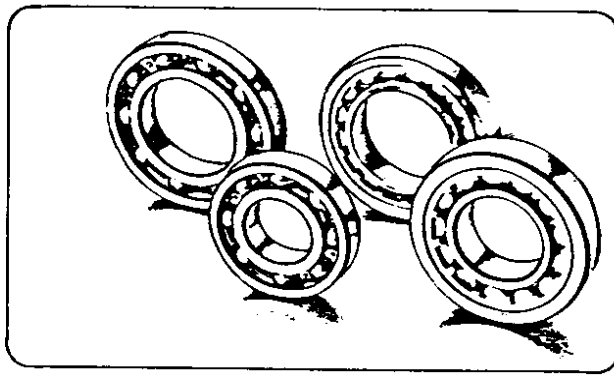

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65, Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : (Opening Shortly) Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000
Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REG-L-No. 7360
Vol. 45 No. 2
Feb.___ 1996

COMING SOON

Quarterly Journal of the Qur'an Academy

Patron: Dr. Israr Ahmad

The Qur'anic Horizons

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an, Lahore, is pleased to announce its forthcoming venture -- a regular periodical in English language.

The journal would include papers and articles written with the following aims and objectives:

- to effectively criticize and refute the un-Islamic features in the dominant Western paradigm;
- to reconstruct Islamic religious thought by presenting various Qur'anic themes in contemporary idiom;
- to find Islamic solutions to the problems afflicting the humanity in general and the Muslim Ummah in particular;
- to develop Qur'anic scholarship in sociology, law, philosophy, psychology, economics, and political science; and
- to develop detailed and practicable blueprints for the future Islamic state.

To receive a free introductory issue, please write to:
The Qur'anic Horizons
36-K, Model Town, Lahore-54700